رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۲۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ　　　جلد ۳۶ ۔ عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفترِ رسالہ "ترجمان القرآن"

ڈ۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے　　　اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards Understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism What ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

(Pakistan)

ترجمان القرآن (لاہور)
شوال سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۵۱ء
جلد ۳۶ عدد ۴

اشاعتِ خاص

نشری تقریریں

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تقدیم

اس سے پہلے میری نشری تقریروں کا ایک مجموعہ "اسلام کا نظامِ حیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ میری چند نشری تقریریں اور بھی ہیں جو پچھلے دس سال کے دوران میں تقسیم سے پہلے آل انڈیا ریڈیو اور تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کی نشرگاہ لاہور سے نشر ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئیں، اور بعض مختلف اوقات میں منتشر طور پر شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ان سب کی یکجائی اشاعت جو فائدہ رکھتی ہے وہ منتشر اشاعت میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ترجمان القرآن کی یہ اشاعتِ خاص ان تقریروں کے مجموعہ کے لئے مختص کی جا رہی ہے۔

ہم ان تقریروں کی اشاعت کی اجازت کے لئے ریڈیو پاکستان کے شکر گزار ہیں۔

افسوس ہے کہ "شبِ برات" کی تقریر عین وقت پر اس مجموعہ سے خارج کر دینی پڑی کیونکہ ریڈیو پاکستان نے اس کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔

ابوالاعلیٰ

اسلام کی اِبتدا

(بچوں کے پروگرام میں)

اسلام کی ابتدا اُسی وقت سے ہے جب سے انسان کی ابتدا ہوئی ہے۔ اسلام کے معنی ہیں "خدا کی تابعداری"، اور یہ انسان کا پیدائشی مذہب ہے، کیونکہ خدا ہی انسان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ انسان کا اصل کام یہی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی تابعداری کرے۔ جس دن خدا نے سب سے پہلے انسان، یعنی حضرت آدم اور ان کی بیوی حضرت حوّا کو زمین پر اتارا اسی دن اس نے انہیں بتا دیا کہ دیکھو، تم میرے بندے ہو اور میں تمہارا مالک ہوں، تمہارے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ میری ہدایت پر چلو، جس چیز کا میں حکم دوں اسے مانو اور جس چیز سے میں منع کروں اس سے رُک جاؤ۔ اگر تم ایسا کروگے تو میں تم سے راضی ہونگا اور تمہیں انعام دُونگا۔ اور اگر اس کے خلاف کروگے تو میں تم سے ناراض ہونگا اور سزا دونگا۔ بس یہی مذہب اسلام کی ابتدا تھی۔

بابا آدم اور اماں حوا نے اسی طریقہ کی تعلیم اپنی اولاد کو دی۔ کچھ مدت تک سب آدمی اس پر چلتے رہے۔ پھر ان میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جنہوں نے اپنے خالق کی تابعداری چھوڑ دی۔ کسی نے دوسروں کو خدا بنا لیا، کوئی خود خدا بن بیٹھا، اور کسی نے کہا کہ میں آزاد ہوں، جو کچھ میرے جی میں آئیگا کرونگا، چاہے خدا کا حکم کچھ بھی ہو۔ اس طرح دنیا میں کفر کی ابتدا ہوئی جس کے معنی ہیں "خدا کی تابعداری سے انکار کرنا"۔

جب انسانوں میں کفر بڑھتا چلا گیا اور اس کی وجہ سے ظلم، فساد اور برائیوں کا طوفان اُٹھنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ ان بگڑے ہوتے لوگوں کو سمجھائیں اور ان کو پھر سے اللہ کا تابعدار بنانے کی کوشش کریں۔ یہ نیک بندے نبی اور پیغمبر کہلاتے ہیں۔ یہ پیغمبر کبھی تھوڑی اور کبھی زیادہ مدت کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آتے رہے۔ یہ سب بڑے سچے، ایماندار اور پاک لوگ تھے۔ ان سب نے ایک ہی مذہب کی تعلیم دی اور وہ یہی اسلام تھا۔ تم نے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے نام تو ضرور سنے ہونگے۔ یہ سب خدا کے پیغمبر تھے اور ان کے علاوہ ہزاروں

پیغمبر اور بھی گذرے ہیں۔

پچھلے کئی ہزار برس کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ جب کفر زیادہ بڑھا تو کوئی بزرگ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے انہوں نے آکر لوگوں کو کفر سے روکنے اور اسلام کی طرف بلانے کی کوشش کی۔ کچھ لوگ ان کے سمجھانے سے مان گئے اور کچھ اپنے کفر پر اڑے رہے۔ جن لوگوں نے مان لیا وہ مسلمان ہو گئے اور انہوں نے اپنے پیغمبر سے اعلیٰ درجہ کے اخلاق سیکھ کر دنیا میں نیکی پھیلانی شروع کی۔ پھر ان مسلمانوں کی اولاد رفتہ رفتہ خود اسلام کو بھول کر کفر کے چکر میں پھنستی چلی گئی، اور کسی دوسرے پیغمبر نے آکر نئے سرے سے اسلام کو تازہ کیا۔ یہ سلسلہ جب ہزاروں برس تک چلتا رہا اور اسلام بار بار تازہ ہو کر پھر بھلا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جنہوں نے اسلام کو ایسا تازہ کیا کہ آج تک وہ قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ۱۴۲۰ سال پہلے عرب کے مشہور شہر مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس وقت صرف عرب ہی میں نہیں، دنیا کے کسی ملک میں بھی اسلام باقی نہ رہا تھا۔ اگرچہ پرانے پیغمبروں کی تعلیم کے تھوڑے بہت اثرات نیک لوگوں کے اندر موجود تھے، لیکن خالص خدا کی تابعداری جس میں کسی دوسرے کی تابعداری شامل نہ ہو، ساری دنیا میں کہیں نہ پائی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے لوگوں کے اخلاق بھی بگڑ گئے تھے۔ خدا کو بھول کر لوگ طرح طرح کی برائیوں میں پھنس گئے تھے۔ اس حالت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ چالیس برس کی عمر تک آپ اپنے شہر میں ایک خاموش انسان کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ سارا شہر آپ کی سچائی اور ایمانداری کی وجہ سے آپ کی عزت کرتا تھا، مگر کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہی شخص آگے چل کر دنیا کا سب سے بڑا رہنما بننے والا ہے۔ آپ بھی دنیا کی برائیوں کو دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتے تھے مگر اس لئے خاموش تھے کہ آپ کو وہ طریقہ معلوم نہ تھا جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو ٹھیک کر دیں۔ جب آپ چالیس برس کی عمر کو پہنچ گئے تو خدا نے آپ کو اپنا پیغمبر بنایا اور یہ خدمت آپ کے سپرد کی کہ پہلے اپنی قوم کو اور پھر دنیا بھر کے انسانوں کو کفر چھوڑ دینے اور اسلام قبول کرنے کی ہدایت فرمائیں۔

اس خدمت پر مقرر ہونے کے بعد آپ نے اپنے شہر کے لوگوں سے برملا کہنا شروع کیا کہ تم خدا کو

چھوڑ کر دوسروں کی بندگی نہ کرو۔ تمہارا مالک اور خالق صرف خدا ہے۔ اسی کی تم کو عبادت کرنی چاہیے اور اسی کا حکم تمہیں ماننا چاہیے۔ عام لوگ یہ آواز سن کر آپ کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہر طریقہ سے آپ کی زبان بند کرنی چاہی۔ لیکن قوم کے جتنے سچے اور اچھے لوگ تھے وہ رفتہ رفتہ آپ کے حامی بنتے چلے گئے۔ پھر مکہ سے باہر عرب کے دوسرے علاقوں میں بھی آپ کی تعلیم پہنچنے لگی اور وہاں میں بھی جو اکھڑ جاہل لوگ تو مخالفت پر تل گئے، مگر جن لوگوں میں عقل اور نیک دلی موجود تھی وہ آپ کی سچی باتوں پر ایمان لاتے چلے گئے۔ ۱۳ برس تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک طرف آپ کی آواز مکہ میں پھیل رہی تھی اور ہر جگہ نیک انسان اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف جاہلوں کی مخالفت روز بروز سخت ہوتی جا رہی تھی اور طرح طرح سے مسلمانوں کو ستایا جا رہا تھا۔ آخر کار مکہ کے سرداروں نے آپس میں سازش کی کہ ایک رات اچانک آنحضرت پر حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں اور اس کے بعد مسلمانوں کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیں۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو خدا نے آنحضرت کو حکم دیا کہ آپ اور سارے مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ اس وقت مدینہ میں بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے اپنی جان اور مال قربان کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک اسی رات کو مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے جس میں آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہی وہ مشہور واقعہ ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے اور اسی واقعہ کی یادگار میں ہمارا ہجری سنہ جاری ہوا ہے۔

آنحضرت کے مدینے پہنچتے ہی مسلمان بھی عرب کے ہر گوشے سے سمٹ سمٹ کر مدینے میں جمع ہونے شروع ہو گئے اور اس شہر میں اسلام کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی۔

اب اسلام کے مخالف اور بھی زیادہ پریشان ہونے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ پہلے تو یہ مسلمان جگہ جگہ منتشر اور بے بس تھے، ان کو مٹا دینا آسان تھا۔ مگر اب یہ ایک جگہ جمع ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی اپنی حکومت بن گئی ہے۔ اب اگر ان کو ذرا سی مہلت بھی مل گئی تو پھر یہ ایک زبردست طاقت بن جائیں گے۔ اس لئے جلدی سے جلدی کوشش کرنی چاہیے کہ ان پر حملہ کر کے انہیں ختم کر دیا جائے۔ اس خیال سے

مکہ کے سرداروں نے آنحضرت کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور سارے عرب کی طاقتوں کو اسلام کے مقابلہ میں اکٹھا کر لیا۔

لیکن نہ تو وہ لڑائیوں میں آپ کو شکست دے سکے اور نہ اسلام کی تبلیغ کو کسی طرح روک سکے۔ان کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام عرب میں پھیلتا چلا گیا، خود مخالفوں میں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اچھے اچھے آدمی اسلام کی طرف آتے چلے گئے، اور پورے آٹھ برس نہ گزرے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مکہ کو فتح کر لیا۔ مکہ کا فتح ہونا تھا کہ سارے عرب میں کفر کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر اندر پورا ملک مسلمان ہو گیا اور ۱۲ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر اسلام کی ایک طاقتور حکومت قائم ہو گئی جس میں بادشاہی خدا کی تھی، قانون شریعت کا تھا، اور انتظام خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس حکومت میں ظلم اور بداخلاقی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ ہر طرف امن تھا، انصاف تھا، سچائی اور ایمانداری کا دور دورہ تھا، اور خدا کی تابعداری اختیار کرنے کی وجہ سے لوگوں میں بہترین اخلاق پیدا ہو گئے تھے۔

اس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں عرب کی پوری قوم کو بدل ڈالا اور اس کے اندر ایسی روح پھونک دی کہ وہ صرف خود ہی مسلمان نہیں ہو گئی بلکہ ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنحضرت یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

آپ کے بعد صحابۂ کرام نے وہ کام سنبھال لیا جس کے لئے آپ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ ان بزرگوں نے اسلام کی تعلیم عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں پھیلانی شروع کی اور جو طاقتیں حق کے راستے میں مزاحم ہوئیں ان کو تلوار کے زور سے ہٹا کر پھینک دیا۔ ان کا سیلاب ایسا زبردست تھا کہ کسی کے روکے نہ رک سکا۔ چند سال کے اندر وہ سندھ سے لے کر اسپین تک پھیل گئے۔ ان کے اثر سے بڑی بڑی قومیں مسلمان ہو گئیں۔ ان کے قدم جہاں پہنچ گئے وہاں سے بے انصافی اور بداخلاقی رخصت ہو گئی۔ انہوں نے خدا سے پھرے ہوئے انسانوں کو پھر سے خدا کا تابعدار بنایا، جہالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو علم کی روشنی دی، انسانیت سے گرے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر اخلاق کی بلندیوں پر پہنچایا، اور جباروں

کا زور توڑ کر دنیا میں ایسا انصاف قائم کیا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

صحابۂ کرام نے اس کے ساتھ دوسرا کام یہ کیا کہ خدا کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کتاب لے کر آئے تھے اس کو انہوں نے لفظاً بلفظاً یاد بھی کر لیا اور لکھ کر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ آج یہ انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے پاس قرآن ٹھیک ویسا ہی، اسی زبان اور انہی الفاظ میں موجود ہے جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے خدا کی طرف سے پہنچایا تھا۔ اس میں ایک نقطہ کی کمی بیشی بھی نہیں ہوئی ہے۔

ایک اور کام انہوں نے یہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات، آپ کی تقریریں، آپ کے ارشادات، آپ کے احکام، آپ کے اخلاق و عادات، غرض ہر چیز کے متعلق مفصل معلومات بعد کی نسلوں تک پہنچا دیں۔ اس سے دنیا کو یہ فائدہ پہنچا کہ پیغمبر کے جانے کے بعد بھی ہر زمانے کے لوگ پیغمبر کو اسی طرح دیکھ سکتے ہیں جس طرح خود پیغمبر کی زندگی میں دیکھ سکتے تھے۔ ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی آج ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کا تابعدار بندہ کیسا ہونا چاہیئے اور کس نمونے کے آدمی کو خدا پسند کرتا ہے۔

یہ دو چیزیں، یعنی قرآن اور سیرت محمدی، ایسی ہیں جن کے محفوظ ہو جانے کی وجہ سے اسلام دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ پہلے دنیا میں اسلام بار بار تازہ ہو کر اس لئے بھلا یا جاتا رہا کہ جو لوگ پیغمبروں پر ایمان لا کر مسلمان ہوتے تھے وہ خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں کی سیرتوں کو محفوظ رکھنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے تھوڑی مدت بعد مسلمانوں کی اولاد خود ہی بگڑ جاتی تھی۔ لیکن اب خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سیرت دونوں محفوظ ہیں اور اسی وجہ سے اسلام ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا ہے۔ کبھی خدانخواستہ اس کی تازگی میں کچھ کمی آبھی جائے تو قرآن اور سیرت محمدی کی مدد سے اس کو پھر تازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب دنیا کو کسی نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اسلام کو تازہ کرنے کے لئے صرف ایسے لوگ کافی ہیں جو قرآن اور سیرت محمدی کو اچھی طرح جانیں، اس پر خود عمل کریں، اور دوسروں سے اس پر عمل کرانے کی کوشش کریں۔

۶ر جولائی ۱۹۴۲ء

سرورِ عالم

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ ہندی میں اس کا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں ( )۔ بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے۔ مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے اُس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اُس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم، یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک محب وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کر لیں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپ کا لیڈر بہرحال نہیں ہو سکتا جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، ایک ہندوستانی کو اُس سے کیا تعلق کہ وہ اُسے اپنا لیڈر مانے؟ بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو بڑھانا چاہتا ہو تب تو دوسری قوموں کے لوگ الٹی اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اُسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اس کی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو۔ اور اپنی خیر خواہی میں کسی طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر بننے کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہٰذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لئے یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لئے نہ ہو بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابل پیروی ہو جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانہ میں کارآمد اور دوسرے زمانہ میں بیکار ہو اس کو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جاسکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اس کی رہنمائی بھی کارآمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کرکے دکھایا ہو اور ان کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اُس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کرلیں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محب وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محب انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل، یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب، اونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُن کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ انہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں دوسرے طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی اسی طرح اُن کے رفیق کار بنے جس طرح عرب۔ اور اُن کے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُن کو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُن کی اپنی قوم نے۔ یہ اِسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی[1] کی زبان سے اُس شخص

[1] خیال رہے کہ یہ تقریر اُس زمانہ میں ہوئی تھی جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک ملک تھے۔

کی تعریف سُن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہُوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجئے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ

"کائنات کا نظام فی الواقع جس اصُول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُسی کے مطابق ہو۔ کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جُزء ہے اور جُزء کی حرکت کا کُل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے"

اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجئے اور پورے کرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپ کے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں اُن سب کی جڑ کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کریں گے، جتنی چھان بین اور تحقیق کریں گے، حاصل یہی نکلے گا کہ:

انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

اس لئے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے اور یہ چیز اُسے ظالم بنا دیتی ہے۔ یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ خدا سے بے پروا ہو کر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیئے اس کا نتیجہ بُرا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین،

سُورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی سب خدا کی مِلک ہیں۔ اور انسان اِس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اُس کا ایک جزء ہونے کے باوجود اُس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کرے گا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانونِ زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ بُرا نکلتا ہے۔ اِسی طرح اُس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحبِ اختیار و اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا اور اس کی آقائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خدا کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی برا ہی نکلتا ہے۔ یہ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اُس کے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اُس کے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اُس کے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، یہی ایک اصلاحی تجویز ان کی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اُتنی ہی آج بھی ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہو گی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کر کے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سرِ اطاعت جھکانے پر آمادہ کر دیا۔ اُن سے خود پرستی بھی چھڑوائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی۔ پھر اُن کو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظامِ اخلاق، نیا نظامِ تمدن، نیا نظامِ معیشت، اور نیا نظامِ حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے

سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی، کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا سارے جہان کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا، تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۴۱ء

میلاد النبی

آج اُس عظیم الشان انسان کا جنم دن ہے جو زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لئے رحمت بن کر آیا تھا اور وہ اصول اپنے ساتھ لایا تھا جن کی پیروی میں ہر فرد انسانی، ہر قوم و ملک، اور تمام نوع انسان کے لئے یکساں فلاح اور سلامتی ہے۔ یہ دن اگرچہ ہر سال آتا ہے، مگر اب کے سال یہ ایسے نازک موقع پر آیا ہے جب کہ زمین کے باشندے ہمیشہ سے بڑھ کر اس دانائے کامل کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ معلوم نہیں مسٹر برنارڈ شا نے اچھی طرح جان بوجھ کر کہا تھا یا بے جانے بوجھے، مگر جو کچھ انہوں نے کہا وہ بالکل سچ تھا کہ محمدؐ اگر اس وقت دنیا کے ڈکٹیٹر ہوتے تو دنیا میں امن قائم ہو جاتا۔ میں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود نہ سہی، ان کے پیش کردہ اصول تو بے کم و کاست موجود ہیں، ان کے اصولوں کو بھی اگر ہم راستبازی کے ساتھ ڈکٹیٹر مان لیں تو وہ سارے فتنے[ف] ختم ہو سکتے ہیں جن کی آگ سے آج نسلِ آدم کا گھر جہنم بنا ہوا ہے۔

اب سے چودہ سو برس پہلے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت خود ان کا اپنا وطن اخلاقی پستی، بدنظمی اور بدامنی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ قرآن میں اس وقت کی حالت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے کہ "تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے جس سے خدا نے تمہیں بچا لیا" اس سے کچھ بہتر حالت دنیا کے دوسرے ملکوں کی نہ تھی۔ ایران اور مشرقی رومی سلطنت اس وقت انسانی تہذیب کے دو سب سے بڑے گہوارے تھے۔ اور ان دونوں کو ایک طرف آپس کی باہم لڑائی اور دوسری طرف خود اپنے گھر کے معاشرتی امتیازات، معاشی ناہمواری اور مذہبی جھگڑوں نے تباہ کر رکھا تھا۔ ان حالات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور تئیس برس کے اندر انہوں نے نہ صرف عرب کو بدل ڈالا بلکہ ان کی رہنمائی میں عرب سے جو تحریک اٹھی تھی اس نے ایک چوتھائی صدی کے اندر

[ف] خیال رہے کہ یہ جنگ عظیم نمبر ۲ کے انتہائی زور کا زمانہ تھا۔

ہندوستان کی سرحدوں سے شمالی افریقہ تک دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی میں درست کر کے رکھ دیا۔

یہ اصلاح کیونکر ہوئی؟ ایک مختصر گفتگو میں اس کی ساری تفصیلات بیان کرنا ناممکن ہے لیکن اس کے موٹے موٹے اصول میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جس پر انہوں نے زور دیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان صرف خدائے واحد کو اپنا آقا، مالک، معبود اور حاکم تسلیم کریں۔ خدا کے سوا کسی کی بندگی قبول نہ کریں۔ صرف مذہب کے محدود دائرے ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں تنہا خدا کے اقتدار اعلیٰ کے آگے جھک جائیں۔

اس کے ساتھ دوسری اہم چیز ان کی تعلیم میں یہ تھی کہ انسان کی مطلق العنانی اور غیر ذمہ داری کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ ہر انسان فرداً فرداً اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اسی طرح انسانی جماعتیں بھی، خواہ وہ خاندانوں اور قبیلوں کی شکل میں ہوں یا طبقات کی شکل میں، قوموں کی شکل میں ہوں یا ریاستوں اور حکومتوں کی شکل میں، بہرحال خدا کے حضور اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کا تصور ہی یہ پیش کیا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے، اس کو جس قدر اور جس حیثیت میں بھی کچھ اختیارات حاصل ہیں دراصل وہ اس کے ذاتی اختیارات نہیں ہیں بلکہ خدا کے دیے ہوئے ہیں اور ان کے استعمال میں وہ بالآخر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

خدائی اقتدار اعلیٰ اور انسانی خلافت کی بنیادوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کے درمیان منصفانہ وحدت و اتفاق کا وہ رشتہ فراہم کیا جو کسی دوسرے ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ نسل، نسب، زبان، رنگ، وطن، معاشی مفاد اور دوسری جتنی چیزیں سوسائٹی کی بنیاد بنتی ہیں، لازمی طور پر انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کا مدمقابل بنا دیتی ہیں۔ ان میں اگر موافقت ہوتی بھی ہے تو اغراض کی بنا پر ایک ناپائیدار عارضی موافقت ہوتی ہے۔ کشمکش اور جنگ اس تقسیم کی عین فطرت میں داخل ہے اور اس کا لازمی نتیجہ بے انصافی ہے۔

اس کو دور کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ تمام انسانوں کو خدا کی بندگی پر متحد کیا جائے اور خدا کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس پیدا کر کے انہیں انصاف پر آمادہ کیا جائے۔

قومیت اور طبقات کے بجائے خدا کی بندگی اور خلافت کے تصور پر جس عالمگیر سماجی زندگی کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اس کے ہر پہلو کو انہوں نے پائیدار اخلاقی اصولوں پر ڈھال دیا۔ ان کے پیش کیے ہوئے اخلاقیات تارک الدنیا درویشوں کے لئے نہیں تھے بلکہ دنیا کا کام چلانے والے لوگوں کے لیے تھے۔ کسان، زمیندار، مزدور، کارخانہ دار، تاجر، خریدار، پولیس مین، مجسٹریٹ، کلکٹر، جج، گورنر، سپاہی اور سپہ سالار، وزیر اور سفیر ہر ایک کو اس کے دائرہ عمل میں انہوں نے اخلاق کے ایسے ضابطوں سے باندھ دیا جن کی بندشوں کو کھولنا اور کسنا، جس کے اصولوں کو بنانا اور بگاڑنا افراد یا رائے عام کی خواہشات پر منحصر نہیں تھا۔ انہوں نے معاشرت اور شخصی تعلقات کو، آرٹ اور ادب کو، کاروبار اور لین دین کو، سیاست اور انتظامِ ملکی کو، بین الاقوامی تعلقات اور صلح وجنگ کو، غرض انسانی زندگی کے سارے معاملات کو، اخلاق کا پابند بنایا اور جو چیز بھی انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہو اس کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر نشوونما پائے۔

یہ وہ بڑے بڑے اصول تھے جن پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلاحی پروگرام مبنی تھا۔ اس پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ انفرادی اصلاح سے شروع ہوتا تھا۔ ان کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ اجتماعی اصلاح کے ہر نقشہ کا دارومدار بالآخر افراد ہی پر آ کر ٹھیرتا ہے کوئی بہتر سے بہتر نظام بھی کمزور کیرکٹر اور ناقابل اعتماد سیرت کے لوگوں کے ذریعہ سے کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ افراد کی سیرت کی خامیوں سے ایک نظام کے عمل درآمد میں جو رخنے اور شگاف پڑتے ہیں، انہیں کاغذ پر نہیں بھرا جا سکتا۔ کاغذ کی دنیا میں آپ مختلف ممکن خرابیوں کے سدباب کا جس قدر چاہیں خیالی انتظام کر لیں، لیکن عمل کی دنیا میں اس کاغذی نقشہ کو چلانے کا انحصار بہرحال کارکن افراد ہی پر ہو گا۔ یہ افراد اگر بجائے خود خواہشات، اغراض اور تعصبات سے شکست کھا جانے والے لوگ ہوں، اگر ان کے اندر سچا ایمان اور پختہ کیرکٹر نہ ہو، تو آپ کی ساری خیالی احتیاطوں کے باوجود اس نظام میں

رخنے پڑیں گے اور ایسی ایسی جگہوں سے پڑیں گے جہاں تک آپ کا تصور بھی نہ جا سکے گا۔ بخلاف اس کے کاغذ پر ایک نظام کو دیکھ کر آپ اس میں بہت سے رخنوں کا امکان ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کو چلانے کے لئے اگر بھروسے کے قابل افراد موجود ہوں تو ان کا صحیح عمل ان سارے رخنوں کو بھر دے گا جن کے رونما ہونے کا امکان عالمِ خیال میں آپ کو نظر آتا ہو۔

اسی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی ساری قوت ایسے افراد کو تیار کرنے پر صرف کی جو ان کے پروگرام کے مطابق بہترین طریقہ پر دنیا کی اصلاح کر سکتے ہوں۔ انہوں نے ایسے لوگ تیار کیے جو ہر حال میں خدا سے ڈر کر بدی سے پرہیز کرنے والے ہوں۔ جو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو پیشِ نظر رکھنے والے ہوں۔ جو ہر اس کام سے رک جانے والے ہوں جس کے متعلق انہیں خدا کی ناراضی کا اندیشہ ہو اور ہر اس کام میں دل و جان سے کوشش کرنے والے ہوں جس کے متعلق انہیں معلوم ہو جائے کہ خدا اس سے ناخوش ہوگا۔ جنہیں خدا کی خوشنودی پر اپنی کسی چیز کو قربان کرنے میں تامل نہ ہو۔ جن کے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف، کسی کی مہربانی کا لالچ، اور کسی کے انعام کی تمنا نہ ہو۔ جن کے لئے پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کوئی فرق نہ ہو۔ جو رات کے پردوں میں بھی اتنے ہی نیک، شریف، اور پرہیزگار ہوں جتنے پبلک میں منظرِ عام پر نظر آئیں۔ جن پر یہ بھروسہ کیا جا سکے کہ بندگانِ خدا کی جان، مال، آبرو اگر ان کے چارج میں دے دی جائے تو خیانت کا رتابت نہ ہوں گے۔ اپنی ذات یا اپنی قوم اور حکومت کی طرف سے کوئی عہد کریں تو بے وفا نہ نکلیں گے۔ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں تو ظالم نہ پائے جائیں گے۔ لین دین کے بازار میں بیٹھیں تو بدمعاملگی نہ کریں گے۔ حق مانگنے میں چاہے سست ہوں مگر حق ادا کرنے میں سست نہ ہوں گے۔ اور اپنی ذہانت، ہوشیاری، تدبر اور قوت و قابلیت کو راستی اور انصاف کے لئے اور انسانیت کی فلاح کے لئے استعمال کریں گے نہ کہ شخصی یا قومی اغراض کی خاطر دوسروں کو بے وقوف بنانے اور دوسروں کے حق تلف کرنے کے لیے۔

کامل پندرہ سال تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے افراد کی تیاری میں لگے رہے۔ اس مدت میں آپ نے حق پرستوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تیار کر لی جو صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کی

اصلاح کے لئے سچا عزم رکھتی تھی اور جس میں عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے افراد بھی شامل تھے۔

اس جماعت کو منظم کرنے کے بعد آپ نے وسیع پیمانہ پر سماج کی اصلاح کے لئے عملی جدوجہد شروع کی اور صرف آٹھ برس میں بارہ لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سرزمین عرب کے اندر مکمل اخلاقی، معاشی، تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کر کے رکھ دیا۔

پھر یہی جماعت جسے آپ نے منظم کیا تھا عرب کی اصلاح سے فارغ ہو کر آگے بڑھی اور اس نے اُس زمانہ کی مہذب دنیا کے بیشتر حصے کو اس انقلاب کی برکتوں سے مالا مال کر دیا جو عرب میں رونما ہوا تھا۔

آج ہم نئے نظام نئے نظام (نیو آرڈر) کی آوازیں ہر طرف سے سُن رہے ہیں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جن بنیادی خرابیوں نے پرانے نظام کو آخر کار فتنہ بنا کر چھوڑا وہی اگر صورت بدل کر کسی نئے نظام میں بھی موجود ہوں تو وہ نیا نظام ہوا کب۔ وہ تو وہی پرانا نظام ہوگا جس کے کاٹنے اور ڈسنے سے جاں بلب ہو جانے کے بعد ہم نئے نظام کا تریاق مانگ رہے ہیں۔ انسانی اقتدار اعلیٰ، خدا سے بے نیازی و بے خوفی، قومی و نسلی امتیازات، ملکوں اور قوموں اور طبقوں کی سیاسی و معاشی خود غرضیاں، اور ناخدا ترس افراد کا دنیا میں برسر اقتدار ہونا، یہی ہیں وہ اصلی خرابیاں جو اس وقت تک نوع انسانی کو تباہ کرتی رہی ہیں اور آئندہ بھی اگر ہماری زندگی کا نظام انہی خرابیوں کا شکار رہا تو یہ ہمیں تباہ کرتی رہیں گی۔ اصلاح اگر ہو سکتی ہے تو انہی اصولوں پر ہو سکتی ہے جن کی طرف انسانیت کے ایک سچے بہی خواہ نے اب سے صدیوں پہلے ہماری محض رہنمائی ہی نہ کی تھی بلکہ عملاً اصلاح کر کے دکھا دی تھی۔

۳۰ مارچ سنہ ۴۲ء

سرورِ عالم کا اصلی کارنامہ

دنیا جانتی ہے کہ نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اُس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم ترین زمانہ سے نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے اُٹھتا رہا ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پاکیزہ اخلاقی زندگی کا درس جو ہمیشہ سے دنیا کے پیغمبر، رشی اور مُنی دیتے رہے ہیں وہی آنحضرت نے بھی دیا ہے۔ انہوں نے کسی نئے خدا کا تصور پیش نہیں کیا ہے اور نہ کسی نرالے اخلاق ہی کا سبق دیا ہے جو اُن سے پہلے کے رہبرانِ انسانیت کی تعلیم سے مختلف ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ اُن کا وہ اصلی کارنامہ کیا ہے جس کی بنا پر ہم انہیں تاریخ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ بیشک آنحضرت سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاقیات سے کیا تعلق ہے۔ بلاشبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اصولوں سے آگاہی حاصل تھی، مگر اسے واضح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں ان اخلاقی اصولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہئے۔ خدا پر ایمان، اصولِ اخلاق، اور عملی زندگی، یہ تین الگ الگ چیزیں تھیں جن کے درمیان کوئی منطقی رابطہ کوئی گہرا تعلق اور کوئی نتیجہ خیز رشتہ موجود نہ تھا۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام میں سمو دیا اور ان کے امتزاج سے ایک مکمل تہذیب و تمدن کا نقشہ محض خیال کی دنیا ہی میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں بھی قائم کر کے دکھا دیا۔

انہوں نے بتایا کہ خدا پر ایمان محض ایک فلسفیانہ حقیقت کے مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا مزاج اپنی عین فطرت کے لحاظ سے ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے اور اس اخلاق کا ظہور انسان کی عملی زندگی کے پورے رویہ میں ہونا چاہئے۔ ایمان ایک تخم ہے جو نفسِ انسانی میں جڑ پکڑتے

ہی اپنی فطرت کے مطابق عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے اور اس درخت کے تنے سے لے کر اس کی شاخ شاخ اور پتی پتی تک میں اخلاق کا وہ جیون رس جاری و ساری ہو جاتا ہے جس کی سوتیں تخم کے ریشوں سے ابلتی ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین میں بوئی تو جائے آم کی گٹھلی اور اس سے نکل آئے لیموں کا درخت، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں بویا تو گیا ہو خدا پرستی کا بیج اور اس سے رونما ہو جائے ایک مادہ پرستانہ زندگی جس کی رگ رگ میں بداخلاقی کی روح سرایت کیے ہوئے ہو۔ خدا پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق اور شرک، دہریت، یا رہبانیت سے پیدا ہونے والے اخلاق یکساں نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے یہ سب نظریے اپنے الگ الگ مزاج رکھتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج دوسرے سے مختلف قسم کے اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر جو اخلاق خدا پرستی سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف ایک خاص عابد و زاہد گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہیں کہ صرف خانقاہ کی چار دیواری اور عزلت کے گوشے ہی میں ان کا ظہور ہو سکے۔ ان کا اطلاق وسیع پیمانے پر پوری انسانی زندگی اور اس کے ہر ہر پہلو میں ہونا چاہیے۔ اگر ایک تاجر خدا پرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تجارت میں اس کا خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہ ہو۔ اگر ایک جج خدا پرست ہے تو عدالت کی کرسی پر اور ایک پولیس مین خدا پرست ہے تو پولیس پوسٹ پر اس سے غیر خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم خدا پرست ہے تو اس کی شہری زندگی میں، اس کے انتظام ملکی میں، اس کی خارجی سیاست میں اور اس کی صلح و جنگ میں خدا پرستانہ اخلاق کی نمود ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا ایمان باللہ محض ایک لفظ بے معنی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ خدا پرستی کس قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے اور ان اخلاقیات کا ظہور کس طرح انسان کی عملی زندگی میں، اور انفرادی و اجتماعی رویہ میں ہونا چاہیے، تو یہ ایک وسیع مضمون ہے جسے ایک مختصر گفتگو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر میں نمونے کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات آپ کو سناؤں گا جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آنحضرت کے مرتب کیے ہوئے نظام زندگی میں ایمان، اخلاق اور عمل کا امتزاج کس نوعیت کا ہے۔ سنیے، حضور فرماتے ہیں:۔

[1] الایمان بضع وسبعون شعبة افضلها قول لا اله الا الله وادناها اماطة الاذى۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ عربی عبارات نشر نہیں کی گئی تھیں بلکہ صرف ان کا ترجمہ نشر کیا گیا تھا۔

عن الطریق والحیاءُ شعبۃ من الایمان۔

"ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ اُس کی جڑ یہ ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کو معبود نہ مانو، اور اس کی آخری شاخ یہ ہے کہ راستے میں اگر تم کوئی ایسی چیز دیکھو جو بندگانِ خدا کو تکلیف دینے والی ہو تو اُسے ہٹا دو۔ اور حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے۔"

الطھور شطر الایمان

"جسم و لباس کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔"

المؤمن من آمنہ الناس علی دمائھم واموالھم

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو۔"

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عھد لہ

"اس شخص میں ایمان نہیں ہے جس میں امانت داری نہیں۔ اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں۔"

اذا سرتک حسنتک وساءتک سیئاتک فانت مؤمن

"جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور برائی کر کے تجھے پچھتاوا ہو تو تو مومن ہے۔"

الایمان الصبر والسماحۃ

"ایمان تحمل اور فراخ دلی کا نام ہے۔"

افضل الایمان ان تحب للہ وتبغض للہ وتعمل لسانک فی ذکر اللہ وان تحب للناس ما تحب لنفسک وتکرہ لھم ما تکرہ لنفسک۔

"بہترین ایمانی حالت یہ ہے کہ تیری دوستی اور دشمنی خدا واسطے کی ہو، تیری زبان پر خدا کا نام جاری ہو، اور تو دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور ان کے لئے وہی کچھ ناپسند کرے جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔"

اکمل المومنین ایمانًا احسنھم خلقًا والطفھم باھلہ

"تم میں سب سے زیادہ کامل ایمان اُس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔"

مَنْ کان یُؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیکرم ضَیفہٗ ومن کان یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یُؤذِ جارہٗ ومن کان یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیقُل خیراً اَوْ لیَصْمُتْ۔

"جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے، اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دینی چاہئے، اور اس کی زبان کھُلے تو بھلائی پر کھُلے ورنہ چُپ رہے۔"

لیس المومن بالطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی

"مومن کبھی طعنے دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو اور زبان دراز نہیں ہوا کرتا۔"

یطبع المومن علی الخصال کلھا الا الخیانۃ والکذب

"مومن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا اور خائن نہیں ہو سکتا۔"

واللّٰہ لا یؤمن واللّٰہ لا یؤمن واللّٰہ لا یومن الذی لا یامن جارہٗ بوائقہ

"نہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی بدی سے اُس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔"

لیس المومن بالذی یشبع وجارہٗ جائع الی جنبہ

"جو شخص خود پیٹ بھر کھالے اور اس کے پہلو میں اُس کا ہمسایہ بھوکا رہ جائے وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

مَنْ کَظَمَ غیظًا وھو یقدر علی ان ینفذہٗ ملأ اللّٰہ قلبہٗ امنًا وایمانًا۔

"جو شخص اپنا غصہ نکال لینے کی طاقت رکھتا ہو اور پھر ضبط کر جائے اس کے دل کو خدا ایمان اور اطمینان سے لبریز کر دیتا ہے۔"

من مشی مع ظالم لیقویہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام

"جو شخص کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ دے وہ اسلام سے نکل گیا۔"

مَن صلّٰی یُرائی فقد اَشرَکَ ومن صام یُرائی فقد اشرك ومن تصدّق یُرائی فقد اَشرَکَ

"جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی، اُس نے شرک کیا۔ جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ اور جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے خیرات کی اُس نے شرک کیا۔"

اَربَعٌ مَن کُنَّ فیہ کانَ مُنافِقًا خالِصًا۔ اِذا ائتُمِنَ خانَ وَاِذا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذا عاھَدَ غَدَرَ وَاِذا خاصَمَ فَجَرَ۔

"چار صفات ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے۔ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ بولے تو جھوٹ بولے۔ عہد کرے تو اسے توڑ دے اور لڑے تو شرافت کی حد سے گزر جائے۔"

عُدِلَت الشھادۃ الزور بالاشراك باللہ۔

"جھوٹی گواہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ شرک کے قریب جا پہنچتا ہے۔"

اَلمُجاھِدُ من جاھد نفسہ فی طاعۃِ اللہ، والمُھاجِرُ من ھجر ما نھی اللہُ عنہ

"اصلی مجاہد وہ ہے جو خدا کی فرمانبرداری میں خود اپنے نفس سے لڑے اور اصلی مہاجر وہ ہے جو اُن کاموں کو چھوڑ دے جنہیں خدا نے منع فرمایا ہے۔"

اتدرون من السابقون الی ظل اللہ عز وجل یوم القیامۃ قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ واذا سئلوہ بذلوہ وحکموا للناس کحکمھم لانفسھم۔

"جانتے ہو کہ قیامت کے روز خدا کے سایہ میں سب سے پہلے جگہ پانے والے لوگ کون ہوں گے؟ وہ جن کا حال یہ رہا کہ جب بھی حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مان لیا، اور جب بھی حق ان سے مانگا گیا تو انہوں نے کھلے دل سے دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ خود اپنے معاملہ میں چاہتے تھے۔"

اضمنوا لی ستًّا من انفسکم اَضمن لکم الجنۃ اصدقوا اذا حدّثتم واوفوا اذا وعدتم وادّوا اذا ائتُمِنتُم واحفظوا فروجکم وغضّوا اَبصارکم وکفّوا اَیدیکم

"تم چھ باتوں کی مجھے ضمانت دو، میں جنت کی تمہیں ضمانت دیتا ہوں۔ بولو تو سچ بولو۔ وعدہ کرو تو وفا کرو۔ امانت میں پورے اترو۔ بدکاری سے پرہیز کرو۔ بدنظری سے بچو۔ اور ظلم سے ہاتھ روکو۔"

لا یدخل الجنۃ خبّ ولا بخیل ولا منّان،

"دھوکہ باز اور بخیل اور احسان جتانے والا آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔"

لا یدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من السحت فالنار اولی بہ۔

"جنت میں وہ گوشت نہیں جا سکتا جو حرام کے لقموں سے بنا ہو۔ حرام خوری سے پلے ہوئے جسم کے لئے تو آگ ہی زیادہ موزوں ہے۔"

مَن بَاعَ عیبًا لم یبیّنہ لم یزل فی مقت اللہ ولم تزل الملٰئکۃ تلعنہ۔

"جس شخص نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو عیب سے آگاہ نہ کیا اس پر خدا کا غصہ بھڑکتا رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔"

لو انّ رجلا قتل فی سبیل اللہ ثم عاش ثم قُتل فی سبیل اللہ ثم عاش ثم قتل فی سبیل اللہ ثم عاش وعلیہ دَین ما دخل الجنۃ حتّٰی یُقضٰی دَینہ۔

"کوئی شخص خواہ کتنی ہی بار زندگی پائے اور خدا کی راہ میں جہاد کر کے جان دیتا رہے مگر وہ جنت میں نہیں جا سکتا اگر اس پر قرض ہو اور وہ ادا نہ کیا گیا ہو۔"

ان الرجل لیعمل والمرأۃ بطاعۃ اللہ ستین سنۃ ثم یحضرھما الموت فیضارّان فی الوصیۃ فتجب لھما النار۔

"ایک شخص ۶۰ برس خدا کی عبادت کرتا ہے اور مرتے وقت ایک وصیت میں حق دار کی حق تلفی کر کے اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق بنا لیتا ہے۔"

لا یدخل الجنۃ سیّئ الملکۃ

"وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری طرح افسری کرے۔"

الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصدقۃ والصلوٰۃ؟ اصلاح ذات البین۔ وافساد ذات البین ھی الحالقۃ

"میں تمہیں بتاؤں کہ روزے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟ وہ ہے بگاڑ میں صلح کرانا۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات میں فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو آدمی کی ساری نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔"

ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیمۃ بصلوۃ وصیام وزکوۃ ویاتی قد شتم ھذا وقذف ھذا واکل مال ھذا وسفک دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من خطایاھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار۔

"اصلی مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوا کہ اس کے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ سب ہی کچھ تھا، مگر اس کے ساتھ وہ کسی کو گالی دے کر آیا تھا، کسی پر بہتان لگا کر آیا تھا، کسی کا مال مار کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو پیٹ کر آیا تھا۔ پھر خدا نے اس کی ایک ایک نیکی ان مظلوموں پر بانٹ دی اور جب اس سے بھی حساب چکتا نہ ہوا تو ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے اور اسے دوزخ میں پھونک دیا۔"

لن یھلک الناس حتی یعذروا من انفسھم

"لوگ کبھی نجات سے محروم نہ ہوں اگر اپنی برائیوں کی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو برائیوں پر مطمئن نہ کرتے رہیں۔"

المحتکر ملعون

"جو تاجر قیمتیں چڑھانے کے لئے مال روک رکھے وہ ملعون ہے۔"

من احتکر طعاما اربعین یوما یرید بہ الغلاء فقد بریٔ من اللہ وبریٔ اللہ منہ

"جس نے چالیس دن غلہ اس نیت سے روک رکھا کہ قیمتیں چڑھ جائیں تو خدا کا اس سے اور اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔"

من احتکر طعاما اربعین یوما ثم تصدق بہ لم یکن لہ کفارۃ۔

"چالیس دن غلہ روکنے کے بعد اگر آدمی اس غلے کو خیرات بھی کر دے تو معاف نہ کیا جائے گا۔"

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال میں سے چند ہیں جو میں نے محض نمونے کے طور پر آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ان سے آپکو اندازہ ہوگا کہ حضورؐ نے ایمان، اخلاق اور اخلاق سے زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق کس طرح قائم کیا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے ان باتوں کو صرف باتوں کی حد تک ہی نہ رکھا بلکہ عمل کی دنیا میں ایک پورے ملک کے نظام تمدن و سیاست کو انہی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا اور آپ کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر آپ نوع انسانی کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔

۲۴ر جنوری سنہ ۴۸ء

معراج کی رات

عام روایت کے مطابق آج کی رات معراج کی رات ہے۔ یہ معراج کا واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے۔ لیکن یہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر افسانوں کی تہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ انکی عجائب پسندی کے جذبہ کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیے۔ اس لئے معراج کی اصل روح اور اس کی غرض اور اس کے فائدوں اور نتیجوں کو تو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی؟ براق کیا تھا؟ اور فرشتے کس شکل کے تھے؟ حالانکہ در اصل یہ واقعہ تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانہ کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔ اور اس کی حقیقی اہمیت کیفیت معراج میں نہیں بلکہ مقصد اور نتیجہ معراج میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں ان کی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجئے جیسے دنیا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی ہیں۔ ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ دنیوی حکومتوں کے گورنر اور وائسرائے محض انتظام ملکی کے لیئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور سلطان کائنات کے گورنر اور وائسرائے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق، اور سچے علم و عمل کے وہ اصول بتائیں جو روشنی کے مینار کی طرح انسانی زندگی کی شاہراہ پر کھڑے ہوئے صدیوں تک سیدھا راستہ دکھاتے رہیں۔ مگر اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی مشابہت بھی ہے۔ دنیا کی حکومتیں گورنری جیسے ذمہ داری کے منصب انہی لوگوں کو دیتی ہیں

جو ان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی ہوتے ہیں، اور جب وہ انہیں اس عہدے پر مقرر کر دیتی ہیں تو پھر انہیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع دیتی ہیں کہ حکومت کا اندرونی نظام کس طرح کس پالیسی پر چل رہا ہے۔ اور ان کے سامنے اپنے وہ راز بے نقاب کر دیتی ہیں جو عام رعایا پر ظاہر نہیں کئے جاتے۔ ایسا ہی حال خدا کی سلطنت کا بھی ہے۔ وہاں بھی پیغمبری جیسے ذمہ داری کے منصب پر وہی لوگ مقرر ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے، اور جب انہیں اس منصب پر مقرر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ کرایا اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر کیئے جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیئے جاتے۔

مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کے ملکوت یعنی اندرونی انتظام کا مشاہدہ کرایا گیا[1] اور یہ بھی آنکھوں سے دکھا دیا گیا کہ خدا کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے[2]۔ حضرت موسیٰ کو طور پر جلوۂ ربانی دکھایا گیا اور ایک خاص بندے کے ساتھ کچھ مدت تک پھرایا گیا تاکہ اللہ کی مشیت کے تحت دنیا کا انتظام جس طرح ہوتا ہے اس کو دیکھیں اور سمجھیں[3]۔ ایسے ہی کچھ تجربات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی تھے۔ کبھی آپ خدا کے مقرب فرشتے کو افق پر علانیہ دیکھتے ہیں[4]۔ کبھی وہ فرشتہ آپ سے قریب ہوتے ہوتے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ آپ کے اور اس کے درمیان دو کمانوں کے بقدر بلکہ اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ کبھی وہی فرشتہ آپ کو سدرۃ المنتہیٰ یعنی عالمِ مادی کی آخری سرحد پر ملتا ہے اور وہاں آپ خدا کی عظیم الشان نشانیاں دیکھتے ہیں[5]۔

اسی نوعیت کے تجربات میں سے ایک وہ چیز ہے جس کو معراج کہتے ہیں۔ معراج صرف سیر اور مشاہدہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایسے موقع پر ہوتی ہے جبکہ پیغمبر کو کسی کارِ خاص پر مقرر کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور اہم ہدایات دی جاتی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کی معراج ہی تھی جبکہ ان کو وادیٔ مقدس طویٰ میں خطاب

---

[1] وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام-۹)

[2] وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (بقرہ-۳۵)

[3] فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۔۔۔۔الخ (کہف-۹-۱۰)

[4] وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (التکویر)

[5] وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۔۔۔۔ الی قولہ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم-۱)

کرنے کا حکم دیا گیا کہ مصر جا کر فرعون کو راہِ راست کی دعوت دیں۔ نیز جبکہ انہیں کوہِ طور پر بلا کر مشہور احکام عشرہ دیے گئے۔ اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ کی معراج تھی جب انہوں نے ساری رات پہاڑ پر گذاری اور پھر اٹھ کر بارہ رسول مقرر کیے اور وہ وعظ کہا جو پہاڑی کے وعظ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا ہی ایک اہم موقع وہ تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے، حجاز کے اکثر قبائل میں، اور قریب کے ملک حبش میں آپ کی آواز پہنچ چکی تھی، اور آپ کی تحریک ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنے کو تھی۔ دوسرے مرحلہ سے میری مراد یہ ہے کہ اب وقت آگیا تھا کہ آپ مکہ کی ناموافق سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں آپ کی کامیابی کے لیے زمین تیار تھی۔ اس دوسرے مرحلہ میں آپ کا مشن بہت پھیلنے والا تھا۔ صرف حجاز اور صرف عرب ہی سے نہیں بلکہ گرد و پیش کی دوسری قوموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا، اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی۔ اس لیے اس اہم موقع پر ایک نیا پروانۂ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے بادشاہ کائنات نے آپ کو اپنے حضور میں طلب فرمایا۔

اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے۔ عالم بالا کا یہ حیرت انگیز سفر ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس سفر کے ضمنی واقعات احادیث میں آئے ہیں مثلاً بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کرنا، آسمان کے مختلف طبقات سے گذرنا، پچھلے زمانہ کے پیغمبروں سے ملنا اور پھر آخری منزل پر پہنچنا۔ لیکن قرآن ضمنی چیزوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اصل مقصد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے اس لئے اس نے کیفیت معراج کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ وہ چیز تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کے لیے آنحضرت کو بلایا گیا تھا۔ قرآن کی سترھویں سورت میں آپ کو یہ تفصیل مل سکتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں مکہ کے لوگوں کو آخری نوٹس دیا گیا کہ اگر تمہاری سختیوں کی وجہ سے خدا کا پیغمبر جلاوطنی پر مجبور ہوا تو مکہ میں تم کو چند سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ مل سکے گا[1]۔ اور بنی اسرائیل کو جن سے عنقریب مدینہ میں پیغمبر سے براہِ راست

---

[1] وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل - ۸)

سابقہ پیش آنا تھا۔ خبردار کیا گیا کہ تم اپنی تاریخ میں دو زبردست ٹھوکریں کھا چکے ہو اور دو قیمتی موقعے کھو چکے ہو، اب تم کو تیسرا موقع ملنے والا ہے اور یہ آخری موقع ہے[1]۔

دوسرے حصہ میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن پر انسانی تمدن و اخلاق کی تعمیر ہونی چاہیئے۔ یہ ۱۴ اصول ہیں[2]:

(۱) صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اس کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے۔

(۲) تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے۔ اولاد والدین کی فرمانبردار و خدمت گذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

(۳) سوسائٹی میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا جو لوگ اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

(۴) دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے۔ جو مالدار اپنے روپے کو بُرے طریقے سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

(۵) لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں، نہ بخل کر کے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کر کے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

(۶) رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اُس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے، خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

(۷) معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں۔ جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کرے گا۔

(۸) خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ بُرا راستہ ہے۔ لہٰذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اس کے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیئے۔

(۹) انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے۔ لہٰذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری

---

[1] وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ .... إِلَىٰ قوله عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ (بنی اسرائیل-۱)

[2] سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۳-۴)

بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے۔ نہ کوئی اپنے آپ کو قتل کرے، نہ کسی دوسرے کو قتل کرے۔

(۱۰) یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے، جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

(۱۱) عہد و پیمان کو پورا کیا جائے، انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۱۲) تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک راستی پر ہونی چاہیئے، اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں

(۱۳) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو۔ وہم اور گمان پر نہ چلو۔ کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

(۱۴) نخوت اور تکبر سے پرہیز کرو۔ غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو

یہ ۱۴ اصول جو معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے، ان کی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی۔ دراصل یہ اسلام کا بنیادی دستور تھا، اور وہ پروگرام تھا جس پر آپ کو آنے والے زمانہ میں سوسائٹی کی تعمیر کرنی تھی۔ یہ ہدایات اُس وقت دی گئی تھیں جب آپ کی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلہ سے گزر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی، لہٰذا اس دور کے شروع ہونے سے پہلے ہی بتا دیا گیا کہ خدا کا پیغمبر کن اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کریگا۔ اسی لئے معراج میں یہ ۱۴ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام پیروانِ اسلام کے لئے پانچ وقت کی نماز فرض[له] کی تاکہ جو لوگ اس پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے اُٹھیں ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں، ہر روز پانچ مرتبہ ان کے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا حاکمِ اعلیٰ خدا ہے جس کو انہیں اپنے کام کا حساب دینا ہے۔

۲۰ راگست ۱۹۵۱ء

له أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل ۹)

معراج کا پیغام

اسلام کی تاریخ میں دو راتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک وہ رات جس میں نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول شروع ہوا۔ دوسری وہ رات جس میں آپ کو معراج نصیب ہوئی۔ پہلی رات کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے کہ اس میں نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے وہ روشن ہدایت نامہ بھیجا گیا جو باطل کی تاریکیوں میں حق کا نور صدیوں سے پھیلا رہا ہے اور قیامت تک پھیلاتا رہیگا لیکن دوسری رات کی اہمیت بعض دینیاتی بحثوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس رات میں انسانیت کی تعمیر کے لئے کتنا عظیم الشان کارنامہ انجام پایا۔ آج اس مبارک رات کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ رات ہمارے لیے کیا پیغام لائی ہے۔

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ باوجودیکہ آپ کے مخالفین نے آپ کا راستہ روکنے کے لئے سارے ہی جتن کر ڈالے تھے، پھر بھی آپ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا تھا جس میں دو چار آدمی آپ کے ہم خیال نہ بن چکے ہوں۔ خود مکہ میں ایسے مخلص لوگوں کی ایک مختصر جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی تھی جن سے زیادہ سرگرم اور فداکار حامی دُنیا کی کسی تحریک کو کبھی نہیں ملے۔ اور مدینہ میں دو طاقتور اور خود مختار قبیلوں کی اکثریت آپ کی دعوت پر ایمان لا چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آگیا تھا کہ آپ مکہ سے مدینے منتقل ہو جائیں، تمام ملک کے منتشر مسلمانوں کو اپنے پاس سمیٹ لیں، اور اُن اصولوں پر ایک ریاست قائم کر دیں جن کی اب تک آپ تبلیغ کرتے رہے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب آپ کو معراج کا سفر پیش آیا۔

اس سفر سے واپس آکر جو پیغام آپ نے دیا وہ قرآن مجید کی تسرھویں سورۃ --- سورۂ بنی اسرائیل ---

میں آج تک لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ اس کو دیکھیے، اور اس کے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھیے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کے اصولوں پر ایک نئی ریاست کا سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے وہ ہدایات دی جا رہی ہیں جن پر نبیؐ اور اصحابِ نبی کو آگے کام کرنا تھا۔

اس پیغام میں معراج کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت دلائی گئی ہے۔ مصریوں کی غلامی سے نکل کر بنی اسرائیل نے جب آزاد زندگی شروع کی تھی تو خداوندِ عالم نے اُن کی رہنمائی کے لیے کتاب عطا فرمائی تھی اور تاکید کر دی تھی کہ میرے سوا اب اپنے معاملات کی تکمیل کسی اور کے ہاتھ میں نہ دینا۔ مگر بنی اسرائیل نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفرانِ نعمت کیا اور زمین میں مصلح بننے کے بجائے مفسد و سرکش بن کر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ایک مرتبہ ان کو بابل والوں سے پامال کرایا، اور دوسری مرتبہ رومیوں کو اُن پر مسلط کر دیا۔ اس سبق آموز تاریخ کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ چیز ہے جو تمھیں ٹھیک ٹھیک راستہ بتائے گی۔ اس کی پیروی میں کام کرو گے تو تمھارے لیے بڑے انعام کی بشارت ہے۔

دوسری اہم حقیقت جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ہی عمل اس کے حق میں فیصلہ کن ہے۔ سیدھا چلے گا تو آپ اپنا بھلا کرے گا۔ غلط راہ پر جائے گا تو خود ہی نقصان اُٹھائے گا۔ اس شخصی ذمہ داری میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہے، اور نہ کسی کا بار دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ایک صالح معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنی ذاتی ذمہ داری پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ دُوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہوں، اُسے پہلی فکر یہ ہونی چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔

تیسری بات جس پر متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اُس کے بڑے لوگوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے خوشحال اور مالدار اور صاحبِ اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں، اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے

ہاں سیاسی اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

پھر مسلمانوں کو وہ بات یاد دلائی گئی ہے جو قرآن میں بار بار دہرائی جاتی رہی ہے کہ اگر تمہارے پیش نظر صرف یہی دنیا اور اس کی کامیابیاں اور خوشحالیاں ہوں تو یہ سب کچھ تمہیں مل سکتا ہے۔ مگر اس کا آخری انجام بہت برا ہے۔ مستقل اور پائدار کامیابی جو اس زندگی سے لے کر دوسری زندگی تک کہیں نامرادی سے داغ دار نہ ہونے پائے، تمہیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ تم اپنی کوششوں میں آخرت اور اس کی بازپرس کو پیش نظر رکھو۔ دنیا پرست کی خوشحالی بظاہر تعمیر کی شان رکھتی ہے مگر اس تعمیر میں ایک بہت بڑی خرابی کی صورت مضمر ہے۔ وہ اخلاق کی اس فضیلت سے محروم ہوتا ہے جو صرف آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھنے ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ فرق تم دنیا ہی میں دونوں طرح کے آدمیوں کے درمیان دیکھ سکتے ہو۔ یہی فرق بعد کی منازل حیات میں اور زیادہ نمایاں ہو جائیگا، یہاں تک کہ ایک کی زندگی سراسر ناکامی اور دوسرے کی زندگی سراسر کامیابی بن کر رہے گی۔

ان تمہیدی نصیحتوں کے بعد وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرے کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ ۱۴ اصول ہیں، اور میں انہیں اسی ترتیب سے آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں جس طرح وہ معراج کے اس پیغام میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ خدائے واحد کے سوا کسی کی خداوندی نہ مانی جائے۔ صرف وہی تمہارا معبود ہو، اسی کی تم بندگی و اطاعت کرو، اور اسی کے حکم کی پیروی تمہارا شعار ہے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تم نے تسلیم کیا، خواہ وہ کوئی غیر ہو یا تمہارا اپنا نفس، تو آخر کار تم قابل مذمت بن کر رہو گے اور ان برکتوں سے محروم ہو جاؤ گے جو صرف خدا کی تائید سے ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔[1]

---

[1] یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ ہی نہ تھا بلکہ اس سیاسی نظام کا جسے بعد میں مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا، اولین بنیادی اصول بھی تھا۔ اس کی پوری عمارت اس نظریہ پر اٹھائی گئی تھی کہ خداوند عالم ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور خدا کی شریعت ہی ملک کا قانون ہے۔

۲۔ انسانی حقوق میں سب سے اہم اور مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہیے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جس میں اولاد والدین سے بے نیاز اور سرکش نہ ہو بلکہ اُن سے نیک سلوک کرے۔ اُن کا احترام ملحوظ رکھے اور بڑھاپے میں اُن کی ویسی ہی ناز برداری کرے جو کبھی بچپن میں وہ اُس کی کر چکے ہیں۔[1]

۳۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی، اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری و ساری رہے۔ ہر رشتہ دار اپنے دوسرے رشتہ دار کا مددگار ہو۔ ہر محتاج انسان دوسرے انسانوں سے مدد پانے کا حق دار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص اُن سب انسانوں کے حقوق اپنے اوپر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہے۔ ان کی کوئی خدمت کرے تو یہ سمجھے کہ وہ ان کا حق ادا کر رہا ہے نہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے۔ اور اگر کسی خدمت کے قابل نہ ہو تو معذرت کرے اور خدا سے فضل مانگے تاکہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔[2]

---

[1] اس دفعہ کی رو سے یہ طے کر دیا گیا کہ اسلامی نظام معاشرت کی بنا خاندان پر رکھی جائیگی اور خاندانی نظام کا محور والدین کا ادب و احترام ہوگا۔ بعد میں اسی دفعہ کے منشا کے مطابق والدین کے وہ شرعی حقوق معین کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آداب تہذیب میں وہ خیالات و اطوار پیوست کر دیے گئے جو خدا اور رسول کے بعد والدین کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام کے ذریعہ سے خاندان کو کمزور کرنے کے بجائے مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی۔

[2] اس دفعہ کی بنیاد پر مدینہ طیبہ کے معاشرے میں صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے احکام دیے گئے۔ وصیت، وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے۔ یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے۔ اور پھر اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ سے پورے معاشرے میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی ایسی روح پھونک دی گئی کہ لوگوں کے اندر (باقی صفحہ ۲۲۶ پر)

۴۔ لوگ اپنی دولت کو غلط طریقوں سے ضائع نہ کریں۔ فخر اور ریا اور نمائش کے خرچ، عیاشی اور فسق و فجور کے خرچ، اور تمام ایسے خرچ جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہا دیں، دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے بھائی ہیں اور ایک صالح معاشرے کا فرض ہے کہ ایسے بے جا صرفِ مال کو اخلاقی تربیت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ سے روک دے۔

۵۔ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ تو بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع کریں۔ معاشرے کے افراد میں توازن کی ایک ایسی صحیح حس پائی جانی چاہیے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بیجا خرچ کی خرابیوں میں مبتلا بھی نہ ہوں۔[1]

(بقیہ حاشیہ ۲۲۵) قانونی حقوق کے ماسوا اخلاقی حقوق کا ایک وسیع ترین تصور پیدا ہو گیا۔ اور اس کی بنا پر لوگ خود بخود ایک دوسرے کے ایسے حق بھی پہچاننے اور ادا کرنے لگے جو کسی قانون کے زور سے نہ مانگے جا سکتے ہیں اور نہ دلوائے جا سکتے ہیں۔

[1] مدینہ کی سوسائٹی میں ان دونوں دفعات کے منشا کی ترجمانی مختلف طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازروئے قانون حرام کر دیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بھی بیجا صرفِ مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف حکومت کو یہ اختیارات دیے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو وہ اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے اور جو لوگ اپنے مال میں بہت زیادہ نا روا طریقوں سے تصرف کرنے لگیں ان کی جائداد کو عارضی طور پر خود اپنے انتظام میں لے لے۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام بھی پیدا کی گئی جو فضول خرچیوں پر واہ واہ کرنے کے بجائے ملامت کرے، اور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے افراد کے نفس کی اصلاح بھی کی گئی تاکہ وہ بجا اور بے جا خرچ کے فرق کو خود سمجھیں اور بے جا خرچوں سے آپ ہی باز رہیں۔ اسی طرح بخل کو بھی جس حد تک قانون کے ذریعہ سے توڑا جا سکتا تھا اس کے لیے قانون سے کام لیا گیا اور باقی اصلاح کا کام رائے عام کے زور اور اخلاقی تعلیم کی طاقت سے لیا گیا۔ آج یہ اسی کا اثر ہے کہ مسلمان سوسائٹی میں کنجوسوں اور زراندوزوں کو جس بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کی مثال کسی دوسری سوسائٹی میں نہ ملے گی۔

۶۔ خدا نے اپنے رزق کی تقسیم کا جو نظام قائم کیا ہے، انسان اپنی مصنوعی تدبیروں سے اُس میں دخل انداز نہ ہو۔ اُس نے اپنے سب بندوں کو رزق میں مساوی نہیں رکھا ہے بلکہ ان کے درمیان کم و بیش کا فرق رکھا ہے۔ اس کے اندر بہت سی مصلحتیں ہیں جن کو وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے اس طریقہ سے قریب تر ہو۔ فطری نامساوات کو ایک مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا، یا نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں یکساں غلط ہیں۔[1]

۷۔ نسلوں کی افزائش کو اس ڈر سے روک دینا کہ کھانے والے بڑھ جائیں گے تو معاشی ذرائع تنگ ہو جائیں گے، ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ جو لوگ اس اندیشے سے آنے والی نسلوں کو ہلاک کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ رزق کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ رازق وہ خدا ہے جس نے انسانوں کو زمین میں بسایا ہے۔ پہلے آنے والوں کے لیے بھی رزق کا سامان اسی نے کیا تھا اور بعد کے آنے والوں کے لیے بھی وہی سامان کرے گا۔ جتنی آبادی بڑھتی ہے، خدا اسی نسبت سے معاشی ذرائع بھی وسیع کر دیتا ہے۔ لہٰذا لوگ خدا کے تخلیقی انتظامات میں بے جا دخل اندازی نہ کریں

[1] اس دفعہ میں قانونِ فطرت کے جس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیل سرے سے کوئی راہ ہی نہ پا سکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوت اور تفاضل بجائے خود کوئی بے انصافی ہے اور انصاف قائم کرنے کے لئے امیری اور غریبی کا فرق مٹانا اور ایک بے طبقات معاشرہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا کسی درجہ میں بھی مطلوب ہے۔ اس کے برعکس مدینہ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو راہِ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرت اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور دفعات ۳، ۴، ۵ کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانین کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے اُن بے شمار اخلاقی، روحانی اور تمدنی فوائد کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

اور کسی قسم کے حالات میں بھی ان کے اندر "نسل کشی" کا میلان پیدا نہ ہونے پائے۔[1]

۸۔ زنا عورت اور مرد کے تعلق کی بالکل ایک غلط صورت ہے۔ اس کو نہ صرف بند ہونا چاہیئے بلکہ معاشرے کے اندر اُن اسباب کا بھی سدّ باب کیا جانا چاہیئے جو انسان کو اس کے قریب لے جاتے ہیں۔[2]

۹۔ انسانی جان کو اللہ نے قابل احترام ٹھیرایا ہے۔ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی جان۔ خدا کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت صرف اسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جب کہ خدا ہی کا مقرر کیا ہوا کوئی حق اُس کے خلاف قائم ہو جائے۔ پھر حق قائم ہو جانے کے بعد بھی خونریزی صرف اُس حد تک ہونی چاہیئے جہاں تک حق کا تقاضا ہو۔ قتل میں اسراف کی تمام صورتیں بند ہو جانی چاہئیں، مثلاً جوشِ انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا جن کے خلاف حق قائم نہیں ہوا ہے یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی کرنا، یا ایسی ہی دوسری انتقامی زیادتیاں جو دنیا میں رائج رہی ہیں۔[3]

---

[1] یہ دفعہ ان معاشی بنیادوں کو قطعی طور پر منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے لے کر آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں افلاس کا خوف قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا۔ اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن معراج کے پیغام کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر کھانے کے ذرائع بڑھانے کی تعمیری سعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے۔

[2] یہ دفعہ آخرکار اسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اس کے منشا کے مطابق زنا اور تہمتِ زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا، پردے کے احکام جاری کئے گئے، فواحش کی اشاعت پر پابندیاں عائد کی گئیں، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر بندشیں لگائی گئیں، اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح نہایت آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کا خاتمہ کر دیا گیا۔

[3] اس دفعہ کی بنیاد پر اسلامی قانون میں خودکشی کو حرام کیا گیا۔ قتلِ عمد کو جرم ٹھیرایا گیا۔ (باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

۱۰۔ یتیموں کے مفاد کی اس وقت تک حفاظت ہونی چاہیئے جب تک وہ خود اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں۔ ان کے مال میں کوئی ایسا تصرف نہ ہونا چاہیے جو خود ان کے مفاد کے لیے بہتر نہ ہو۔[ل]

۱۱۔ عہد و پیمان خواہ افراد ایک دوسرے سے کریں، یا ایک قوم دوسری قوم سے کرے، بہرحال ایمانداری کے ساتھ پورے کیے جائیں۔ معاہدوں کی خلاف ورزی پر خدا کے ہاں بازپرس ہو گی۔[ع]

۱۲۔ ناپ اور پیمانے اور اوزان ٹھیک رکھے جائیں اور لین دین میں صحیح تول تولی جائے۔[ع]

۱۳۔ تم کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کے صحیح ہونے کا تمہیں علم نہ ہو۔ اپنی سماعت اور بینائی کا اور اپنے دلوں کی نیتوں اور خیالات اور ارادوں کا تمہیں خدا کو حساب دینا ہے۔[ع]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) قتل خطا کی مختلف صورتوں کے لئے خون بہا اور کفارے تجویز کیے گئے۔ اور قتل بالحق کو صرف تین صورتوں میں مقید کر دیا گیا۔ ایک یہ کہ کوئی شخص قتل عمد کا مرتکب ہوا ہو، دوسرے یہ کہ کسی شادی شدہ مرد یا عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہو۔ تیسرے یہ کہ کسی شخص نے اسلامی نظام جماعت کے خلاف خروج کیا ہو۔ پھر قتل بالحق کا فیصلہ کرنے کے اختیارات بھی صرف قاضی شرع کو دیئے گئے۔ اور اس کا ایک مہذب ضابطہ بنا دیا گیا۔

[ل] یہ محض ایک اخلاقی ہدایت ہی نہ تھی بلکہ یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلامی نظام حکومت میں قانونی اور انتظامی دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیلات ہم کو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ پھر اسی دفعہ سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انا ولی من لا ولی لہ اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

[ع] یہ بھی صرف اسلامی اخلاقیات ہی کی ایک اہم دفعہ نہ تھی بلکہ آگے چل کر اسلامی حکومت نے اسی کو اپنی داخلی و خارجی سیاست کا سنگ بنیاد قرار دیا۔

[ع] اس دفعہ کے مطابق اسلامی حکومت کے محکمۂ احتساب پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک فرض یہ بھی عائد ہوا کہ وہ منڈیوں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سدباب کرنا حکومت کا فرض ہے۔

[ع] یہ حاشیہ صفحہ ۴۳ پر دیکھیں

۱۴۔ زمین میں جباروں اور متکبروں کی چال نہ چلو، تم نہ اپنی اکڑ سے زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ اپنے غرور میں پہاڑوں سے سربلند ہو سکتے ہو؂۔

یہی وہ اصول تھے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے پہنچ کر اسلامی سوسائٹی اور اسلامی ریاست کی تعمیر فرمائی۔

۵۔ جون ۴۸ء

(حاشیہ از صفحہ سابق) اس دفعہ کا منشا یہ تھا کہ مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان اور قیاس کے بجائے "علم" کی پیروی کریں۔ اس منشا کی ترجمانی اخلاق میں، قانون میں، ملکی نظم ونسق اور سیاست میں اور نظامِ تعلیم میں مختلف طریقوں سے بہت وسیع پیمانے پر کی گئی اور ان بے شمار خرابیوں سے اسلامی معاشرے کو بچایا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول مقرر کیا گیا کہ محض شبہ پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیشِ جرائم میں یہ قاعدہ طے کر دیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مارپیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں بھی یہ پالیسی معین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے اور نہ شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظامِ تعلیم میں بھی اُن تمام نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کے اندر ایک حقیقت پسندانہ ذہنیت پیدا کی گئی۔

؂ یہ بھی محض ایک واعظانہ بات نہ تھی بلکہ درحقیقت اس میں مسلمانوں کو پیشگی تنبیہ کی گئی تھی کہ ایک حکمراں گروہ بننے کے بعد وہ غرور وتکبر میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ جو حکومت اس منشور کے مطابق مدینہ طیبہ میں قائم کی گئی اس کے فرمانرواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زبان یا قلم سے نکلا ہوا ایک جملہ بھی آج ہمیں ایسا نہیں ملتا جس میں ادائے تکبر کا ادنیٰ شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ جنگ میں بھی انہوں نے کبھی فخر وغرور کی کوئی بات زبان سے نہ نکالی۔ ان کی نشست وبرخاست، چال ڈھال اور عام برتاؤ، ہر چیز میں انکسار وتواضع کی شان پائی جاتی تھی، اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب جمانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

معراج کا سفرنامہ

معراج پیغمبرِ اسلام کی زندگی کے اُن واقعات میں سے ہے جنہیں دنیا میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ۲۷ رجب کی رات کو پیش آیا۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ معراج کس غرض کے لیے ہوئی تھی اور خدا نے اپنے رسول کو بلاکر کیا ہدایات دی تھیں۔ حدیث یہ بتاتی ہے کہ معراج کس طرح ہوئی اور اس سفر میں کیا واقعات پیش آئے۔

اس واقعہ کی تفصیلات ۲۸ معصر راویوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ سات راوی وہ ہیں جو خود معراج کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور ۲۱ وہ جنہوں نے بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زبانِ مبارک سے اس کا قصہ سنا۔ مختلف روایتیں قصہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور سب کو ملانے سے ایک ایسا مفصل سفرنامہ بن جاتا ہے جس سے زیادہ دلچسپ، معنی خیز اور نظارا فروز سفرنامہ انسانی لٹریچر کی پوری تاریخ میں نہیں ملتا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گذر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرمِ کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھاکر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اُسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریلؑ نے تھپکی دے کر کہا، دیکھ کیا کرتا ہے، آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت

کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ اُس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اُتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسٰیؑ سے ہم کلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا اِدھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبریلؑ نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی اِدھر آؤ۔ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اُس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجیے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچکر آپ بُراق سے اُتر گئے اور اُسی مقام پر اُسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاءؑ اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اُس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لیے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں پانی، دوسرے میں دودھ، تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اُٹھا لیا۔ جبریلؑ نے مبارک باد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعہ سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے؟ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریلؑ نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ اُن میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا اکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا یہ آدمؑ ہیں، آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسل آدم ہے۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انہیں نماز کے لیے اُٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اُٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا۔ مگر یہ اُن کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا یہ اُس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے پھر نادم ہو کہ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور اُن کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گذرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیے جو اُن کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت

ترش روئی سے ملا۔ آپ نے جبریلؑ سے پوچھا، اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے، ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سن کر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلے سے گذر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریس، پانچویں پر حضرت ہارون، چھٹے پر حضرت موسیٰ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیم ہیں۔

پھر مزید ارتقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام و فرامین براہِ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھیر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہِ جلال سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے روداد سن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جائیے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہ نے ۔ اتنمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے۔ یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انہوں نے آپ کی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنائیے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لئے ایک اور شوشہ ہاتھ آ جائے گا۔ مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔ حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں۔ کہا قوم کو جمع کروں؟ سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟ فرمایا بے شک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کر لیا اور کہا اب کہو جو مجھے سے کہا تھا۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینہ کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن، محال! پہلے تو شک تھا، اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے کہ یہ محمد کے دست راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔

انہوں نے یہ قصہ سُن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، مَیں تو روز سُنتا ہوں کہ اُن کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ پھر حضرت ابوبکر حرمِ کعبہ میں آئے۔ رسول اللہ موجود تھے اور ہنسی اُڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے، آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے۔ وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلے سے گزرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا، قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے، ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا، مَیں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا، سب لوگ سو رہے تھے، مَیں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے ایسے ہی کچھ اور اتے پتے آپ نے دیے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے اُن کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء

روزہ اور ضبطِ نفس

روزے کے بے شمار اخلاقی و روحانی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان میں ضبطِ نفس کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ضبطِ نفس کا مطلب سمجھ لیں، پھر یہ معلوم کریں کہ اسلام کس قسم کا ضبطِ نفس چاہتا ہے، اور اس کے بعد یہ دیکھیں کہ روزہ کس طرح یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو یافتہ ہو اور نفس کی خواہشات و جذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہیں۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمراں کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضاء خودی کے آلۂ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لیے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرے اور نفس کی گذارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کر دے۔ اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں وہ اپنا حکم اپنے منشا کے مطابق نہ چلا سکے اور اس کے لیے نفس کی خواہشیں مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہوں تو وہ ایک مغلوب اور بے بس خودی ہے۔ اس کی مثال اس سوار کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آ گیا ہو۔ ایسے کمزور انسان دنیا میں کسی قسم کی بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تاریخ انسانی میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو پوری طرح اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے، جو خواہشاتِ نفس کے بندے اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ ان کے آقا بن کر رہے ہیں، جن کے ارادے مضبوط اور عزم پختہ رہے ہیں۔

لیکن فرق اور بہت فرق ہے اُس خودی میں جو خود خُدا بن جائے۔ اور اُس خودی میں جو خدا کی تابع فرمان بن کر کام کرے۔ کامیاب زندگی کے لئے خودی کا قابو یافتہ ہونا تو بہر حال ضروری ہے، مگر جو خودی اپنے خالق سے آزاد اور دنیا کے مالک سے بے نیاز ہو، جو کسی بالاتر اخلاقی قانون کی پابند نہ ہو، جس کو کسی حساب لینے والے کی باز پرس کا اندیشہ نہ ہو۔ وہ اگر اپنے جسم و نفس کی طاقتوں پر قابو پا کر ایک پُرزور خودی بن جائے تو وہ دنیا میں فرعون اور نمرود، ہٹلر اور مسولینی جیسے بڑے بڑے مفسد ہی پیدا کر سکتی ہے ایسا ضبطِ نفس نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ وہ اسلام کو مطلوب ہے۔ اسلام جس ضبطِ نفس کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی خودی اپنے خُدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے، اس کی رضا کی طلب اور اس کے قانون کی اطاعت کو اپنا شعار بنا لے۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھ لے، پھر اس مسلم و مومن خودی کو اپنے جسم اور اس کی طاقتوں پر حاکمانہ اقتدار، اور اپنے نفس اور اس کی خواہشوں پر قاہرانہ تسلط حاصل ہو، تاکہ وہ دنیا میں ایک مصلح قوت بن سکے۔

یہ ہے اسلامی نظر سے ضبطِ نفس کی اصل حقیقت۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح انسان میں یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ نفس و جسم کے مطالبات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ طاقتور مطالبے ہیں۔ ایک غذا کا مطالبہ جس پر بقائے حیات کا انحصار ہے۔ دوسرا صنفی مطالبہ جو بقائے نوع کا ذریعہ ہے۔ تیسرا آرام کا مطالبہ جو قوتِ کارکردگی کی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ یہ تینوں مطالبے اگر اپنی حد کے اندر رہیں تو عین منشائے فطرت ہیں لیکن نفس و جسم کے پاس یہی تین پھندے ایسے ہیں کہ ذرا سی ڈھیل پاتے ہی وہ ان کے جال میں پھانس کر آدمی کی خودی کو اُلٹا اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مطالبہ بڑھ کر مطالبات کی ایک فہرست بن جاتا ہے اور ہر ایک زور لگاتا ہے کہ انسان اپنا مقصد زندگی، اپنے اصول اور اپنے ضمیر کے فتوے بھول کر بس اسی کے تقاضے پورے کرنے میں لگا رہے۔ ایک کمزور خودی جب ان تقاضوں سے مغلوب ہو جاتی ہے تو غذا کا مطالبہ اسے بندۂ شکم بنا دیتا ہے۔ صنفی جذبہ اس کو حیوانیت کے

اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے، اور جسم کی آرام طلبی اس کے اندر ارادے کی کوئی طاقت باقی نہیں رہنے دیتی۔ پھر وہ اپنے نفس و جسم کی حاکم نہیں بلکہ ان کی محکوم بن کر رہتی ہے اور اس کا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے احکام کو بھلے اور برے، جائز اور ناجائز، تمام طریقوں سے بجا لایا کرے۔

روزہ نفس کی انہی تین خواہشوں کو اپنے ضابطہ کی گرفت میں لیتا ہے اور خودی کو ان پر قابو پانے کی مشق کراتا ہے۔ وہ اُس خودی کو جو خدا پر ایمان لا چکی ہے، یہ خبر دیتا ہے کہ تیرے خدا نے آج دن بھر کے لئے تجھ پر دانہ پانی حرام کر دیا ہے، اس مدت کے اندر تیرے لئے پاک غذا اور جائز کمائی سے حاصل کی ہوئی غذا بھی جائز نہیں ہے۔ وہ اُس سے کہتا ہے کہ تیرے مالک نے آج تیری صنفی خواہشات پر بھی پابندی عائد کر دی ہے، صبح صادق سے غروب آفتاب تک تیرے لئے حلال طریقہ سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنا حرام ہے۔ وہ اسے یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ تیرے رب کی خوشی اسی میں ہے کہ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد جب تو افطار کرے تو نڈھال ہو کر لیٹ نہ جا بلکہ اٹھ کر عام دنوں سے زیادہ اس کی عبادت کر۔ وہ اس کو یہ حکم بھی پہنچاتا ہے کہ نماز کی لمبی رکعتوں سے فارغ ہو کر جب تو آرام لے تو صبح تک مدہوش ہو کر نہ پڑ جا بلکہ معمول کے خلاف سحری کے لئے اُٹھ اور صبح سے پہلے اپنے جسم کو غذا دے۔ یہ سارے احکام پہنچا دینے کے بعد وہ ان کی تعمیل کا معاملہ خود اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی پولیس، کوئی سی آئی ڈی، کوئی خارجی دباؤ ڈالنے والی طاقت نہیں لگائی جاتی۔ وہ چھپ کر کھائے پیئے یا صنفی خواہشات پوری کرلے تو خدا کے سوا کوئی اُسے دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ تراویح سے بچنے کے لئے کوئی شرعی حیلہ کر دے تو کوئی دنیوی طاقت اس پر گرفت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اُس کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ اگر مومن کی خودی واقعی خدا کی مطیع ہو چکی ہے اور اگر اس کے ارادے میں اتنا زور ہے کہ نفس پر قابو پا سکے تو وہ خود ہی غذا کی مانگ کو، صنفی خواہش کو اور آرام کی طلب کو اُس ضابطہ میں کس دے گا جو آج خلافِ معمول اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہ صرف ایک دن کی مشق نہیں ہے۔ ایسی مشق کے لئے ایک دن کافی بھی نہیں ہو سکتا۔ مسلسل ۳۰ دن خودی سے یہی مشق کرائی جاتی ہے۔ سال بھر میں ایک بار پورے ۷۲۰ گھنٹے کے لئے یہ پروگرام

بتا دیا گیا ہے کہ رات کے آخری حصے میں اٹھ کر سحری کھاؤ۔ صبح پو پھٹتے ہی کھانا پینا بند کر دو، دن بھر ہر قسم کی غذا سے پرہیز کرو، غروب آفتاب کے بعد ٹھیک وقت پر افطار کرو، پھر رات کا ایک حصہ تراویح کی غیر معمولی نماز میں کھڑے رہ کر گزارو، اور چند گھنٹے آرام لینے کے بعد پھر دوسرے دن کے لیے یہی پروگرام شروع کر دو۔ اس طرح مہینہ بھر تک پے درپے نفس کے ان تین سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور مطالبوں کو ضابطے میں کستے رہنے سے خودی کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق اپنے نفس و جسم پر حکومت کر سکے۔ اور یہ عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ کا پروگرام نہیں ہے بلکہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد سے مرنے دم تک ہر سال میں ایک مہینہ اسی مشق کے لیے وقف کیا گیا ہے تاکہ نفس پر خودی کی گرفت بار بار تازہ اور سخت ہوتی رہے۔

یہ ساری مشق محض اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ مومن کی خودی صرف اپنی بھوک، پیاس، شہوت اور آرام طلبی پر قابو پا لے۔ اور اس کی غرض یہ بھی نہیں ہے کہ اس کو نفس و جسم پر یہ قابو صرف ایک رمضان ہی کے مہینے میں حاصل رہے۔ دراصل اس کا مدعا یہ ہے کہ نفس کے ان تین سب سے زیادہ زوردار حربوں کا مقابلہ کر کے وہ اس کے سارے ہی جذبات اور ساری ہی خواہشات پر قابو یافتہ ہو جائے۔ اور اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ محض رمضان ہی میں نہیں بلکہ رمضان کے بعد بھی باقی گیارہ مہینوں میں وہ ہر اس خدمت کے لیے اپنے جسم اور اس کی طاقتوں سے کام لے سکے جو خدا نے اس پر فرض کی ہو، ہر اس بھلائی کے لئے کوشش کر سکے جس میں خدا کی رضا ہو، ہر اس برائی سے رک سکے جو خدا کو ناپسند ہو، اور اپنی خواہشات و جذبات کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھ سکے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اس کی باگیں نفس کے قبضہ میں نہ ہوں کہ جدھر جدھر وہ چاہے اسے کھینچے کھینچے لیے پھرے بلکہ عنان اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نفس کی جن خواہشات کو جس وقت جس حد تک اور جس طرح پورا کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے انہیں اسی ضابطہ کے مطابق پورا کرے۔ اس کا ارادہ اتنا کمزور نہ ہو کہ فرض کو فرض جانتا بھی ہو، ادا بھی کرنا چاہتا ہو، مگر جسم پر اس کا حکم ہی نہ چلتا ہو۔ نہیں، جسم کی مملکت میں وہ اس زبردست حاکم کی طرح رہے جو اپنے

ماتحت عملہ سے ہر وقت اپنے حسبِ منشا کام لے سکتا ہو۔ یہی طاقت پیدا کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ جس شخص نے روزہ سے یہ طاقت حاصل نہ کی اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھوک پیاس اور رت جگے کی تکلیف دی۔

قرآن اور حدیث دونوں میں اس بات کو صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اس کا پانی اور کھانا چھڑوا دینے کی خدا کو کوئی حاجت نہیں۔ نیز حضور نے فرمایا بہت سے روزدار ایسے ہیں جن کو روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔

۱۵ رجولائی ۱۹۴۸ء

عیدِ قرباں

تہوار اور انسان کی سماجی زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب سے آدمی نے اس زمین پر سماجی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے، غالباً اسی وقت سے تہوار منانے کا سلسلہ بھی چلا آ رہا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے، اور کبھی نہیں رہی جس نے سال میں دو چار یا دس پانچ دن اس غرض کے لیے مخصوص نہ کئے ہوں۔ یہ تہوار دراصل سماج کی جان ہیں۔ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا، مشترک جذبات کا مظاہرہ کرنا، مل کر خوشیاں منانا، ایک ہی قسم کی مقررہ رسمیں ادا کرنا، یہ اپنے اندر سریش کی سی خاصیت رکھتا ہے جس سے افراد آپس میں جڑ کر ایک مربوط سوسائٹی بنتے ہیں اور ان میں اجتماعی رُوح نہ صرف پیدا ہوتی ہے بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے تازہ اور بیدار ہوتی رہتی ہے۔

عموماً جو تہوار دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں منائے جاتے ہیں ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تہوار یا تو کسی اہم تاریخی واقعہ کی یادگار میں منایا جاتا ہے، یا کسی بڑے شخص کی ذات سے منسوب ہوتا ہے، یا کسی خاص مذہبی تقریب سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر حال تہوار کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی تقریب ضروری ہے جو ایک قوم کے افراد یا ایک ملک کے باشندوں کے لیے مشترک دلچسپی کی چیز ہو اور جس سے ان کے گہرے جذبات وابستہ ہوں۔ اسی وجہ سے ایک قوم یا ملک کے تہواروں میں دوسری قوم یا ملک کے لوگ دلچسپی نہیں لیتے، اور کسی مصلحت سے بہ تکلف دلچسپی لینا چاہیں بھی تو لے نہیں سکتے۔ کیونکہ ایک قوم کا تہوار جن روایات سے تعلق رکھتا ہے وہ دوسری قوم کے جذبات واحساسات میں وہ حرکت پیدا نہیں کرتیں جو خود اُس قوم میں پیدا کرتی ہیں۔

تہوار منانے کے طریقے بھی دنیا کی مختلف قوموں میں بے شمار ہیں۔ کہیں صرف کھیل کود اور

راگ رنگ اور لطف و تفریح تک ہی تہوار محدود رہتا ہے۔ کہیں تفریحات تہذیب کی حد سے گذر کر فسق و فجور اور ناشائستگی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہیں مہذب تفریحات کے ساتھ کچھ سنجیدہ مراسم بھی ادا کیے جاتے ہیں۔ اور کہیں ان اجتماعی تقریبوں سے فائدہ اٹھا کر لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی روح پھونکنے اور کسی بلند نصب العین کے ساتھ محبت اور گرویدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے جس سے آپ اُس کے مزاج اور اُس کے حوصلوں اور امنگوں کو علانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی بلند اخلاقی روح کسی قوم میں ہو گی اتنے ہی اُس کے تہوار مہذب اور پاکیزہ ہونگے۔ اور اسی طرح اخلاقی اعتبار سے کوئی قوم جتنی پست ہو گی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

اسلام چونکہ ایک عالمگیر اصلاحی تحریک ہے جو کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کا پیرو بنانا چاہتی ہے، اس لیے اس نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے خاص ڈھنگ پر ڈھالا ہے، اسی طرح تہواروں کو بھی ایک نئی شکل دی ہے جو دنیا بھر کے تہواروں سے مختلف ہے۔ سماجی زندگی میں تہوار کی جو اہمیت ہے، اور سماج میں اجتماعی تقریبات کے لیے جو ایک قدرتی پیاس پائی جاتی ہے، اس کو تو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے، مگر تہوار کی تقریب، اور تہوار منانے کے طریقے، اور تہوار کی اخلاقی روح میں بنیادی تغیر کر دیا ہے جس کی تین اہم خصوصیات کی طرف میں آپ کو توجہ دلاؤنگا۔

(۱) ایک عالمگیر تحریک قومی تہواروں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ جن تہواروں کی بنیاد الگ الگ قوموں کی روایات پر ہو، جن کے ساتھ ایک ہی قوم کے جذبات اور دلچسپیاں وابستہ ہوں، اور جن میں ایک قوم کے ساتھ دوسری قوم فطرتاً شریک نہ ہو سکتی ہو وہ دراصل انسانیت کی قومی تقسیم و تفریق کو مضبوط کرنے والی طاقت ہیں۔ ایسے تہوار جس طرح ایک قوم کو اپنے اندر منظم ہونے میں مدد دیتے ہیں اسی طرح وہی ہر قوم کو دوسری قوم سے پھاڑتے اور الگ کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی تحریک جو قومیتوں سے بالاتر ہو کر انسانیت سے بحث

کرتی ہو اور تمام دنیا کے انسانوں کو ایک تہذیب کے رشتے میں پرونا چاہتی ہو، اس قسم کے تہواروں کو صرف یہی نہیں کہ قبول نہیں کر سکتی، بلکہ گوارا بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اس کے مقصد کی راہ میں بالفعل ایک رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اس کے پیش نظر مقصد کا فطری اقتضا یہی ہے کہ جو قومیں اس کے زیر اثر آئیں ان سے وہ قومی تہوار چھڑوا دے اور ایسے تہوار مقرر کرے جن میں وہ سب شریک ہو سکتی ہوں، جو بیک وقت قومی بھی ہوں اور بین الاقوامی بھی، جن کی بنیاد قومی روایات و جذبات پر نہ ہو بلکہ انسانیت کے لیے مشترک اہمیت رکھنے والے جذبات و روایات پر ہو۔

(۲) پھر جو تحریک عالمگیر ہونے کے ساتھ خدا پرستانہ بھی ہو، وہ ایسے تہواروں کو گوارا نہیں کر سکتی جن میں شرک اور مخلوق پرستی اور مشرکانہ توہمات کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ وہ اپنے مشن کی عین فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ جن جن قوموں اور ملکوں میں اس کا اثر پہنچے اُن کے پُرانے مذہبی تہواروں کو اور اُن سب تقریبات کو جو قدیم عقائد کی یاد تازہ کرنے والی ہوں، بند کر دے اور ان کی جگہ ایسے تہوار مقرر کرے جو خدا پرستی کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہوں۔

(۳) خدا پرستی کے ساتھ لازمی طور پر اخلاق کا بھی ایک بلند نصب العین پیدا ہوتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک خدا پرستانہ تحریک اپنے پیروؤں کو ایسے تہوار دے جو فسق و فجور اور ناشائستگی سے بالکل خالی ہوں، جن میں لطف و تفریح تہذیب کے ساتھ اور اظہارِ مسرت سنجیدگی کے ساتھ ہو، جو محض کھیل کود ہی پر ختم نہ ہو جائیں بلکہ جماعتی زندگی میں تہوار سے جو ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے اس کو اعلیٰ درجہ کے اخلاقی مقاصد کے لیے پوری طرح استعمال کیا جائے۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے جو تہوار مقرر کیے ہیں ان میں یہ تینوں خصوصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ عرب، ایران، مصر، شام اور دوسرے ملکوں میں جن قوموں نے اسلام قبول کیا ان کے تمام مذہبی اور قومی تہوار اسلام نے چھڑوا دیے، اور ان کی جگہ دو تہوار رائج کیے جنہیں آپ عید اور بقر عید کے نام سے جانتے ہیں۔ ان میں سے پہلا تہوار تو اس خوشی میں منایا جاتا ہے کہ خدا کے نام پر رمضان کے تیس روزے رکھنے کا جو حکم ہم کو دیا گیا تھا اس کی تعمیل کرنے میں ہم کامیاب ہو گئے لہٰذا اس تعمیل فرمان سے فارغ ہو کر ہم اپنے

مالک کا شکر بجالاتے ہیں۔ رہا دوسرا تہوار تو وہ اُس بے نظیر قربانی کی یادگار ہے جو اب سے چار ہزار برس پہلے خدا کے ایک سچے فرمانبردار بندے نے اپنے مالک کے حضور پیش کی تھی۔ ان دونوں تہواروں میں آپ صریحاً دیکھ سکتے ہیں کہ کسی مخصوص قومیت یا وطنیت کا لگاؤ بالکل نہیں ہے بلکہ وہ ایسی چیزوں کو تہوار کی بنیاد بنایا گیا ہے جن سے دنیا کے سارے خدا پرست انسانوں کے جذبات یکساں وابستہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح دونوں تہواروں میں خداوند عالم کی خالص بندگی کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ کسی قسم کی اکابر پرستی (Hero worship) کا یا کسی مخلوق کی پرستاری کا ادنیٰ سا شائبہ بھی آپ ان میں نہیں پا سکتے۔ پھر ان تہواروں کے منانے کا طریقہ جو مقرر کیا گیا ہے وہ بھی اتنا پاکیزہ ہے کہ اُس سے زیادہ نفیس، تہذیب اور اخلاقی فائدوں سے لبریز طریقہ تصور میں نہیں آسکتا۔ بعد کے مسلمانوں نے اسلامی عید کی اصلی شان کو کسی حد تک جاہلیت کے افعال سے داغ دار کر دیا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جس طرح عید منائی جاتی تھی اس کا نقشہ میں آپ کے سامنے کھینچتا ہوں جس سے آپ اس تہوار کی پاکیزگی کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

عید کے روز صبح کو تمام مسلمان، عورت، مرد، بچے، سب غسل کرتے تھے اور اچھے سے اچھے کپڑے جو خدا نے ان کو دیے ہوں پہن کر نکلتے تھے۔ رمضان کی عید میں نماز کے لیے جانے سے پہلے تمام خوشحال لوگ ایک مقررہ مقدار میں کھانے کا سامان یا اس کی قیمت غریبوں کو دیتے تھے تاکہ کوئی شخص عید کے روز بھوکا نہ رہ جائے۔ بقر عید میں اس کے برعکس نماز کے بعد گھر واپس آکر قربانی کی جاتی تھی اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا۔ ذرا دن چڑھنے پر سب لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ حکم تھا کہ عورت، مرد، بچے سب نکلیں تاکہ مسلمانوں کی کثرت اور ان کی شان کا اظہار ہو۔ خدا سے دعا مانگنے میں بھی سب شریک ہوں، اور اس اجتماعی مسرت میں بھی سب کو شرکت کا موقع مل جائے۔ عید کی نماز مسجد کے بجائے بستی کے باہر میدان میں ہوتی تھی تاکہ بڑے سے بڑا مجمع ہو سکے۔ نماز کے لیے جاتے وقت سارے مسلمان یہ تکبیر پڑھتے ہوئے چلتے تھے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی سب سے بڑا ہے، ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔"

ہر گلی، ہر کوچے، ہر محلے، ہر بازار اور ہر سڑک پر یہی نعرے لگتے چلے جاتے تھے جن سے ساری بستی گونج اُٹھتی تھی۔

عید گاہ کے میدان میں جب سب لوگ جمع ہو جاتے تو صفیں باندھ کر سارا مجمع رسول خدا کی امامت میں پوری باقاعدگی کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرتا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ جمعہ کی نماز کے برعکس یہ خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ آدمی اپنے لیڈر کی اُس اہم تقریر کے وقت موجود رہیں جس کا موقع سال میں صرف دو ہی مرتبہ آتا ہے۔ پہلے ایک تقریر مردوں کے سامنے ہوتی پھر آپ میدان کے اُس حصہ کی طرف تشریف لے جاتے جہاں عورتیں جمع ہوتی تھیں اور وہاں بھی تقریر فرماتے تھے۔ ان تقریروں میں تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کے علاوہ اسلامی جماعت کے متعلق اُن تمام اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی جو اس وقت درپیش ہوتے تھے۔ کوئی فوجی یا سیاسی مہم اگر پیش نظر ہوتی تو اس کا انتظام بھی وہیں اسی مجمع میں کر دیا جاتا۔ جماعتی ضروریات کی طرف بھی لوگوں کو توجہ دلائی جاتی اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ان کے پورا کرنے میں حصہ لیتا، حتیٰ کہ روایات میں آیا ہے کہ عورتیں اپنے زیور تک اتار اتار کر خدا کے دین اور جماعت مسلمین کی خدمت کے لیے پیش کر دیتی تھیں۔

پھر یہ مجمع عید گاہ سے پلٹتا تھا اور حکم یہ تھا کہ جس راستہ سے آئے ہو اس کے خلاف دوسرے راستے سے گھروں کی طرف واپس جاؤ تاکہ بستی کا کوئی حصہ تمہاری چہل پہل سے اور تمہاری تکبیروں کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔

نماز سے واپس ہو کر بقر عید کے روز تمام ذی استطاعت مسلمان قربانی کرتے تھے۔ اس قربانی کا مقصد اُس واقعہ کی یاد ہی کو نہیں بلکہ اُن جذبات کو بھی تازہ کرنا تھا جن کے ساتھ عراق کا رہنے والا ایک غریب الوطن بوڑھا انسان مکہ میں خدا کا اشارہ پاتے ہی خود اپنے بیٹے کو خدا کی محبت پر قربان کرنے

کے لیے تیار ہو گیا تھا اور عین وقت پر خدا نے اپنے رحم و کرم سے اس کو بیٹے کے بدلے مینڈھے کی قربانی پیش کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ٹھیک اسی تاریخ کو اسی وقت تمام مسلمان وہی فعل عملاً کر کے اس جذبے کو تازہ کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح وہ بھی خدا کے مسلم اور مطیع فرمان بندے ہیں، انہی کی طرح اپنی جان، مال، اولاد ہر چیز کو خدا کے حکم اور اس کی محبت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان کا جینا اور مرنا سب کچھ خدا کے لیے ہے۔ اس نیت کا اظہار جانور کو ذبح کرنے کے فعل سے اور ان الفاظ سے ہوتا ہے جو ذبح کے وقت زبان سے ادا کیے جاتے ہیں:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ۔ عَلَىٰ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكْبَرُ۔

"میں نے اپنا رخ پھیر دیا اس ذات کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے میں ٹھیک اسی طریقہ کا پیرو ہوں جو ابراہیمؑ کا طریقہ تھا۔ میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں۔ خدایا! یہ تیرا ہی دیا ہوا مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے، بسم اللہ اللہ اکبر۔"

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے جانور ذبح کیا جاتا تھا اور اس منظر کو گھر کی عورتیں اور بچے سب دیکھتے تھے تاکہ سب کے دلوں میں وہی قربانی اور خدا کی محبت و فرمانبرداری کے جذبات تازہ ہو جائیں پھر یہ گوشت غریبوں اور رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اس کا ایک حصہ گھر میں اپنے کھانے کے لیے بھی رکھ لیا جاتا تھا۔ جانور کی کھال یا اس کی قیمت غریب لوگوں کو دے دی جاتی تھی۔ اور اس کے علاوہ بھی دل کھول کر خیرات کی جاتی تھی تاکہ عید صرف خوشحال لوگوں ہی کا تہوار بن کر نہ رہ جائے۔

بس یہ عید تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منائی جاتی تھی۔ ان سرکاری مراسم کے علاوہ غیر سرکاری طور پر جوان لوگ کچھ کھیل کود بھی کرتے تھے اور گھروں کی لڑکیاں بالیاں مل بیٹھ کر کچھ گیت بھی

گا لیا کرتی تھیں۔ مگر یہ چیز بس ایک حد کے اندر ہی تھی، اُس سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ سوسائٹی کے لیڈر تو جوانوں کی اِن جائز اور معصوم خوش فعلیوں میں بھی حصہ لینے سے اجتناب کرتے تھے تاکہ اُن کی اتنی ہمت افزائی نہ ہو جس سے وہ ناروا مظاہرے کرنے کی جرأت کرنے لگیں۔

اس معاملہ میں لیڈروں کا جو طرزِ عمل تھا اُس کا اندازہ اِس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مستند روایات میں بیان ہوا ہے۔ ایک دفعہ عید کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہ کے پاس پڑوس کی دو لڑکیاں بیٹھی گیت گا رہی ہیں گیت کچھ عشق و عاشقی اور شراب و کباب کے مضمون کے نہ تھے بلکہ جنگِ بُعاث کے زمانہ کے کبت تھے۔ لڑکیاں بھی کوئی پیشہ ور فنکار و موسیقار نہ تھیں بلکہ گھروں کی بہو بیٹیاں تھیں جو کبھی دل بہلانے کو آپس میں بیٹھ کر معصومانہ گیت گا لیا کرتی ہیں۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس تفریح میں دخل نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ ایک گوشہ میں جا کر چادر اوڑھ لیٹ گئے تھوڑی دیر بعد حضرت ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے اپنی صاحبزادی کو ڈانٹ بتائی کہ رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی حرکت ہو رہی ہے۔ ان کی آواز سُن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا "رہنے دو، ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے، آج ہماری عید ہے"۔ آنحضرت کا یہ ارشاد سُن کر حضرت ابوبکرؓ خاموش ہو گئے۔ مگر وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اُن کے پیٹھ موڑتے ہی حضرت عائشہ نے لڑکیوں کو آنکھ کا اشارہ کیا اور وہ اپنے گھروں کو بھاگ گئیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جوان لوگوں کے معصومانہ کھیل کود اور کچھ گا بجا لینے کو جائز تو رکھا جاتا تھا مگر بڑے لوگ خود اِن دلچسپیوں میں حصہ لے کر اُن کی ہمت نہیں بڑھاتے تھے۔ بعد میں جب بڑوں نے حدود کی نگہداشت چھوڑ دی تو رسّی ڈھیلی ہی ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ناچ رنگ سے گذر کر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ

روزِ عید است لبِ خشک بمے آلود کنید

چارۂ کارِ خود اے تشنہ لباں زود کنید

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۱ء

قُربانی

آج سے چار ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ عراق کی سرزمین میں ایک شخص پیدا ہوا تھا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی تاریخ پر اپنا ایک مستقل نشان چھوڑ گیا ہے جس زمانے میں اس نے آنکھیں کھولیں اس وقت تمام دنیا شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھی جس قوم میں وہ پیدا ہوا وہ ایک ستارہ پرست قوم تھی، چاند سورج اور دوسرے سیارے اس کے خدا تھے اور شاہی خاندان انہی خداؤں کی اولاد ہونے کی حیثیت سے اہلِ ملک کا رب مانا جاتا تھا جس خاندان میں وہ پیدا ہوا وہ پروہتوں کا خاندان تھا اور اپنی قوم کو ستارہ پرستی کے جال میں پھانسے رکھنے کا اصل ذمہ دار وہی تھا۔

ایسے زمانے، ایسی قوم، اور ایسے خاندان میں یہ شخص پیدا ہوا۔ دنیا کی عام روش پر چلنے والا ہوتا تو وہ بھی اسی راستے پر جاتا جس پر اس کے خاندان کے لوگ، اس کے ملک کے لوگ اور اس کے زمانے کے لوگ چلے جا رہے تھے۔ کوئی ایسی روشنی بظاہر اس وقت دنیا میں کہیں موجود بھی نہ تھی جو کسی دوسرے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والی ہو۔ اور اس کے ذاتی و خاندانی مفاد کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ کسی اور راستے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لاتا، کیونکہ اس کے خاندان کی مذہبی دوکان تو اسی ستارہ پرستی کے بل پر زور شور سے چل رہی تھی۔ لیکن وہ اُن انسانوں میں سے نہ تھا جیسے شعور خس و خاشاک کی طرح اسی رخ پر اڑنے لگتے ہیں جدھر کی ہوا ہو۔ وہ موروثی تعصب کی بنا پر باپ دادا اور قوم کے طریقے کو بے چون وچرا قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھا کہ جن عقیدوں اور اصولوں پر اس کے بزرگوں نے اور اس کی ساری قوم نے اپنی زندگی کی عمارت قائم کر رکھی ہے وہ بجائے خود صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس آزادانہ تحقیقات کے سلسلے میں اس نے سورج، چاند، زہرہ اور ان سب معبودوں پر نگاہ ڈالی جن کی خدائی کے چرچے وہ بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ایک ایک

کو جانچ کر دیکھا کہ اس پر خدائی کا گمان کہاں تک سچا ہے۔ اور آخر کار یہ بے لاگ رائے قائم کی کہ درصل یہ سب بندے ہیں، خدائی صرف اُس ایک ہستی کی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔

پھر جب یہ حقیقت اس پر منکشف ہوگئی تو اس نے اُن لوگوں کی سی روش اختیار نہیں کی جو ایک بات کو حق جاننے اور سمجھنے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتے۔ اس نے حق کو حق جاننے کے بعد اسے ماننے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کی۔ فوراً اقرار کیا کہ "میں جھک گیا اُس خدا کے آگے جو زمین اور آسمانوں کا خالق ہے"۔ اور اس اقرار کے ساتھ اپنی برادری اور قوم کے سامنے یہ اعلان بھی کر دیا کہ میرا راستہ تم سے الگ ہے، مَیں اس شرک اور بُت پرستی میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں ۔۔۔ یہ اس شخص کی پہلی قربانی تھی۔ یہ پہلی چھری تھی جو اس نے باپ دادا کی اندھی تقلید پر، خاندانی اور قومی تعصبات پر، اور نفس کی ان تمام کمزوریوں پر پھیر دی جن کی وجہ سے آدمی اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف ایک راستے پر صرف اس لئے چلتا رہتا ہے کہ برادری اور قوم اور دنیا اسی پر چلی جا رہی ہے۔

اس اقرار اور اعلان کے بعد یہ شخص خاموش نہیں بیٹھ گیا۔ اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ کائنات کی اصل حقیقت توحید ہے اور شرک سراسر ایک بے بنیاد چیز ہے۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد وہ خود ہی یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ سب انسان جو توحید کے بجائے شرک کے عقیدوں اور مشرکانہ اصولوں پر اپنے مذہب، اخلاق اور تمدن کی عمارت قائم کیے ہوئے ہیں انہوں نے دراصل ایک ایسی شاخ نازک پر آشیانہ بنا رکھا ہے جو سخت ناپائیدار ہے۔ اس احساس نے اُس کو بے چین کر دیا۔ وہ پورے احساسِ فرض کے ساتھ کھڑا ہوگیا کہ اپنی قوم کو شرک سے روکے اور توحید کی طرف دعوت دے۔ اسے معلوم تھا کہ قومی مذہب کے خلاف اس طرح کی علانیہ تبلیغ کرکے وہ خود پروہت کی گدی سے محروم ہو جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا خاندان اگر قومی مذہب سے پھر گیا تو وہ ساری وجاہت ختم ہو جائے گی جو اسے ملک میں حاصل ہے۔ اس کو یہ بھی خبر تھی کہ اس تبلیغ کی وجہ سے ساری قوم کا غصہ اس پر بھڑک اٹھے گا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر نہ تھا کہ یہ تبلیغ اسے حکومت کے عتاب میں مبتلا کر دے گی کیونکہ شاہی خاندان کے اقتدار کی بنیاد ہی وہاں یہ عقیدہ تھا کہ وہ

دیوتاؤں کی اولاد ہے اور اس بنا پر توحید کی دعوت لازماً حکومت کے بنیادی نظریے سے ٹکراتی تھی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھا، اپنے باپ کو، اپنے خاندان کو، اپنی قوم کو اور بادشاہ تک کو اس نے شرک سے باز آنے اور توحید کا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دی، اور جتنی زیادہ اس کی مخالفت کی گئی اتنی ہی زیادہ اس کی سرگرمی بڑھتی چلی گئی۔ آخرکار نوبت یہ آگئی کہ ایک طرف وہ تن تنہا انسان تھا اور دوسری طرف اس کے مقابلہ میں بادشاہ، ملک، برادری، خاندان، حتیٰ کہ اس کا اپنا باپ تک صف آرا تھا۔ اب پورے ملک میں کوئی اس کا دوست نہ تھا۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن تھے ایک ہمدردی کی آواز بھی اس کے حق میں اٹھنے والی نہ تھی۔ اس پر بھی جب اس نے ہمت نہ ہاری اور توحید کی دعوت پیش کرنے سے اس کی زبان نہ تھکی تو فیصلہ کیا گیا کہ برسرِ عام اسے زندہ جلا دیا جائے۔ مگر اس ہولناک سزا کا خوف بھی اسے باطل کو باطل اور حق کو حق کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اس نے آگ کے الاؤ میں پھینکا جانا گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ جس حقیقت پر وہ ایمان لا چکا تھا اس سے پھر جائے اور اسے حقیقت کہنا چھوڑ دے ــــ یہ اس کی دوسری عظیم الشان قربانی تھی۔

نہ معلوم کس طرح خدا نے اُسے آگ میں جلنے سے بچا لیا۔ اس خطرے سے بخیریت گذر جانے کے بعد اس کے لئے ملک میں ٹھیرنا غیر ممکن تھا۔ آخرکار اس نے جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔ آس پاس کے سارے ملک جن میں وہ جا سکتا تھا اُس وقت بُت پرست تھے۔ کہیں کوئی ایسی چھوٹی سے چھوٹی برادری یا سوسائٹی بھی موجود نہ تھی جو توحید کی قائل ہوتی جس کے پاس وہ پناہ لے کر امن کی زندگی پا سکتا۔ اس حالت میں امن پانے کی صرف یہی ایک صورت ممکن تھی کہ وہ اپنے ملک سے نکل جانے کے بعد دعوتِ توحید سے زبان بند کر لیتا۔ انفرادی طور پر اگر ایک اجنبی آدمی کسی مذہب کا پیرو ہو تو دوسرے ملکوں کے لوگ اسے خواہ مخواہ چھیڑنے کی تکلیف کیوں کرنے لگے تھے۔ بلکہ انہیں یہ معلوم ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ مگر یہ خدا کا بندہ دوسرے ملکوں میں بھی جا کر خاموش نہ رہا۔ جہاں بھی گیا اس نے خدا کے سب بندوں کو یہی دعوت دی کہ دوسروں کی بندگی چھوڑو اور صرف اسی ایک خدا کے بندے بن کر رہو جو حقیقت میں تمہارا خدا ہے۔ اس تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ملک سے نکل کر بھی اسے کہیں چین سے

ٹھنا نصیب نہ ہوا کبھی شام میں ہے تو کبھی فلسطین میں، کبھی مصر میں ہے تو کبھی حجاز میں۔ غرض ساری عمر یونہی ملک ملک کی خاک چھانتے گزر گئی۔ اس کو آرام کے ٹھکانے کی طلب نہ تھی۔ اس کو گھر اور کھیت اور مویشی اور کاروبار کی طلب نہ تھی۔ اس کو دنیا کے عیش اور زندگی کے سروسامان کی طلب نہ تھی۔ اسے صرف اس چیز کی طلب تھی کہ جس حق پر وہ ایمان لایا ہے اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے بنی نوع گمراہی کو چھوڑ کر اس سیدھی راہ پر چلنے لگیں جس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔ یہی طلب اسے جگہ جگہ لیے پھرتی تھی اور اسی طلب کے پیچھے اس نے اپنے ہر مفاد کو تج دیا ـــــ یہ اس کی تیسری قربانی تھی۔

اس خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کے عالم میں پھرتے پھرتے جب عمر تمام ہونے کو آئی تو خدا نے اسے ایک بیٹا دیا۔ اس بچے کو پالا پوسا۔ یہاں تک کہ وہ اس عمر کو پہنچا جب اولاد والدین کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے اور زندگی کی دوڑ دھوپ میں ان کا ساتھ دینے کے قابل ہوتی ہے۔ بیٹا اور وہ بھی اکلوتا بیٹا بھر عنفوانِ شباب کو پہنچا ہوا۔ اور باپ زندگی کے اس مرحلے میں جبکہ آدمی جوان اولاد کے سہارے کا سب سے بڑا محتاج ہوتا ہے۔ ہر شخص اس صورت حال کا تصور کر کے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس باپ کو وہ بیٹا کیسا کچھ عزیز ہو گا۔ مگر مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اسے خدا اور اس کی مرضی سے بڑھ کر کوئی چیز بھی عزیز نہ ہو۔ اس لیے وہ ساری قربانیاں بھی کافی نہ سمجھی گئیں جو یہ بندہ اپنے خدا کے لئے ساری عمر کرتا رہا تھا۔ ان سب کے بعد اس کا آخری امتحان لینا ضروری سمجھا گیا اور وہ یہ تھا کہ یہ بندۂ مسلم اپنے اس عزیز ترین بیٹے کی محبت کو بھی خدا کی محبت پر قربان کر سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ امتحان بھی لے ڈالا گیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ بوڑھا انسان اپنے خدا کا صریح حکم نہیں، محض ایک اشارہ پاتے ہی اکلوتے نوجوان بیٹے کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ خدا نے عین ذبح کے وقت لڑکے کی جگہ مینڈھے کو قبول کر لیا، کیونکہ خدا کو لڑکے کا خون مطلوب نہ تھا محض محبت کی آزمائش مقصود تھی، لیکن اس سچے مسلمان نے اپنی نیت کی حد تک تو اپنا لختِ جگر اپنے خدا کے اشارے پر قربان کر ہی دیا تھا ـــــ یہی وہ آخری اور سب سے بڑی قربانی ہے جو اس شخص نے اپنے اسلام اور ایمان اور خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ اسی کے صلے میں خدا نے اسے تمام دنیا کے انسانوں کا امام بنایا

اور اپنی دوستی کے مرتبے پر سرفراز کیا۔

آپ سمجھے کہ یہ کس شخص کا ذکر ہے؟ یہ اُس ذات گرامی کا ذکر ہے جسے آج ہم سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے جانتے ہیں۔ اور یہی وہ قربانی ہے جس کی یادگار آج دنیا بھر کے مسلمان جانوروں کی قربانی کر کے مناتے ہیں۔ اس یادگار کے منانے کا مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان کے اندر قربانی کی وہی روح، اسلام و ایمان کی وہی کیفیت اور خدا کے ساتھ محبت و وفاداری کی وہی شان پیدا ہو جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیم نے اپنی پوری زندگی میں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص محض ایک جانور کے گلے پر چھری پھیرتا ہے اور اس کا دل اس روح سے خالی رہتا ہے تو وہ ناحق ایک جاندار کا خون بہاتا ہے۔ خدا کو اس کے خون اور گوشت کی کوئی حاجت نہیں۔ وہاں تو جو چیز مطلوب ہے وہ دراصل یہ ہے کہ جو شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لائے وہ مکمل طور پر بندۂ حق بن کر رہے۔ کوئی تعصب، کوئی دلچسپی، کوئی ذاتی مفاد، کوئی دباؤ اور لالچ، کوئی خوف اور نقصان، غرض کوئی اندر کی کمزوری اور باہر کی طاقت اس کو حق کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔ وہ خدا کی بندگی کا اقرار کرنے کے بعد پھر کسی دوسری چیز کی بندگی قبول نہ کرے۔ اس کے لئے ہر تعلق کو قربان کر دینا آسان ہو مگر اس تعلق کو قربان کرنا کسی طرح ممکن نہ ہو جو اس نے اپنے خدا سے قائم کیا ہے۔ یہی قربانی اسلام کی اصل حقیقت ہے اور آج ہر زمانے سے بڑھ کر ہم اس کے محتاج ہیں کہ یہ حقیقت ہماری سیرتوں میں پیوست ہو۔ مسلمانوں نے جب کبھی دنیا میں چوٹ کھائی ہے اسلام کی اسی حقیقت سے خالی ہو کر کھائی ہے۔

اکتوبر ۴۷ء

پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے

[یہ ایک مباحثہ ہے جو مئی ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے نشر ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں سائل کی حیثیت سے جناب وجیہ الدین صاحب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے ابوالاعلیٰ مودودی۔]

س۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے؟

م۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہوگا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔

س۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرینِ دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لائے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ اُن کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ

کو سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے سے وابستہ کردیں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تعبیر پیش کی جائیگی وہ اُن کے سیاسی رجحان کی آئینہ دار ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہوجائے گا۔ اقتصادی کشمکش ایک لامتناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کرے گی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

م: جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اُس روح سے اور انصاف کے اُن اصولوں سے محروم ہوگیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور اُن کے درمیان اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکرا دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشاکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو اُن اجتماعی فلسفوں کے حوالہ کردیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ — طبقاتی جنگ — برپا کردیں اور ہمیں اُس وقت تک امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیا میٹ نہ کردے۔ دوسری قوموں نے تو اِن اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لئے قبول کرلیا کہ اُن کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خودغرضیوں کے نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کردیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے اُن لوگوں کو اُبھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہوکر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کرسکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق، یا اکثریت کے ساتھ، جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی پشت پناہی

پوری قوم کو بحیثیتِ مجموعی کرنی چاہیے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں اُن کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں، اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں[1]۔

س۔ میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں صرف خلوص اور ایمانداری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کے لیے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

م۔ آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دنیویات" کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اُن "ماہرین دینیات" کے حوالہ کر دیا جو دنیویات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور

[1] وقت کی کمی کے باعث سائل کو اس شبہ کا تفصیلی جواب نہ دیا جا سکا کہ اسلامی ریاست کو چلانا کسی مخصوص "مذہبی طبقے" کا کام ہوگا۔ سائل نے یہ شبہ مسیحی تھیاکریسی اور پاپائی نظام اور "پریسٹ ہڈ" سے اخذ کیا تھا اور اس کا تفصیلی جواب ریڈیو کی مختصر گفتگو میں ممکن نہ تھا۔ یہاں اشارۃً صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست کے چلانے والے لوگوں کو عوام الناس اپنے ووٹوں سے منتخب کریں گے اور یہ انتخاب ان کی سیرت اور قابلیت کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ کسی طبقہ کی رکنیت کے لحاظ سے۔

اپنی معیشت کے مسائل اُن "ماہرین دینیات" کے حوالے کیے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اُسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی گھر کے اندر طبقاتی خودغرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خودغرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں اُن لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا، دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری قومی زندگی کو ساری دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دے۔

س۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل پیش آئے گی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور اُن کی لفظی حیثیت ہمارے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سود ہی کو لیجیے۔ سُود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن جائز تجارت کو روا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء جب اقتصادیات پر فتویٰ لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں مہاجنی سُود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بدحالی اس شئے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

م۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اُس کے الفاظ لے لیے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی روح سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں مگر ظاہرداری کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہو گی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لیے اپنے اندر سے اُنہی لوگوں کو منتخب کریں گے جو قرآن و سنت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ اُن کی رُوح کو بھی سمجھتے ہوں۔[1]

س۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی اختلافات ہیں۔ اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

م۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے۔ اور انہیں بھی ہم اُسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو، ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اُس نقطۂ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل التعداد گروہوں کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ اُتنی رعایت کی جائے جس کی اصول میں گنجائش ہو۔ نیز اقلیت کی حیثیت سے اُن کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کر دیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاستِ اسلام

[1] وقت کی کمی کے سبب سے اُن اقتصادی مسائل پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی جنہیں سائل نے اپنے سوال میں چھیڑا تھا۔ ان مسائل پر تفصیلی گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "سود" اور "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل"۔

کے اُن وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لیے اتفاق کر لیں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

س: مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کس طرح ان کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار رہیں؟

ج: اس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ پر ایک ملک کا نظام اُنہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اُس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے حقوقِ شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن از روئے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اُس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اس کی اس رائے کے مطابق بنے۔ اقلیت اُس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے، مگر یہ کہنے کا اُسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا وفاداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اُس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جائے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب تک کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت تو یہ دیکھے گی کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بیزار بن کر۔

ص - میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اُس اندازِ فکر اور فلسفۂ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیرکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اُس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرے گا۔ ہم اُس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی، اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی دُور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کریں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

م - آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُرزور میلان رکھتے ہیں اور اُن کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ اُن کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کی صورتِ حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا سکتے تھے، بلکہ درحقیقت اس وقت ریاست

کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لیے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؛ یا وہ طرزِ عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؛ یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؛ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اُسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

۱۸ رمئی ۱۹۴۸ء

زندگی بعدِ موت

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیسی ہے؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دُور ہے۔ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اُس پار جھانک کر دیکھ سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سُن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ اُدھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اُس کے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ بالکل ایک غیر سائنٹفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رو سے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے، اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ جب تک ہم کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو خالص سائنٹفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹفک رویہ کو نباہ سکتے ہیں؟ شاید نہیں — بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ضرور ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اُسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرزِ عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اُس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تب تو آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایماندار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اُس

وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے مگر اس کی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کریں گے عملاً اس کی صورت وہی تو ہوگی جو اس کی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو اقرار یا انکار بہر حال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے غور و فکر ہی سے آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویہ کا سارا انحصار ہی اسی سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا۔ اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہوگا اور وہاں میرا اچھا یا بُرا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا تو یقیناً میرا اخلاقی طرزِ عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس یہاں سے بمبئی تک جانا ہے اور بمبئی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا بلکہ وہاں وہ پولیس اور عدالت اور ہر اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے بمبئی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے، اس کے بعد اسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو ہندوستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس پورے کارنامہ کا خفیہ ریکارڈ موجود ہے جو میں نے ہندوستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجہ کا مستحق ہوں۔ آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرزِ عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص صرف یہاں سے بمبئی تک کے سفر کی تیاری کرے گا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لیے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے بمبئی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ

نہیں۔ اور دوسرا یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع یا نقصان سفر کے پہلے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلہ میں ہے۔ پہلا شخص اپنے اعمال کے صرف اُنہی نتائج پر نظر رکھے گا جو بمبئی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں لیکن دوسرے شخص کی نگاہ ان نتائج پر ہو گی جو سمندر پار، دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرزِ عمل کا یہ فرق براہِ راست نتیجہ ہے اُن کی اُس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے اس کی سمت کا تعیّن اس بات پر منحصر ہو گا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت میں اُٹھے گا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہو گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے۔ اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لیے اس معاملہ میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں۔ شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کریں گے وہ بھی لامحالہ انکاری کے رویہ جیسا ہو گا۔ لہٰذا ہم بہرحال اس امر کا تعیّن کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں۔ اگر سائنس اس کے تعیّن میں ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے۔

اچھا تو عقلی استدلال کے لیے ہمارے پاس کیا مواد ہے؟ ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظامِ کائنات۔ ہم انسان کو اس نظامِ کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے آیا اس کے سارے مقتضیات اِس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز ایسی بچی رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھیے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے متوازی، کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ اِن چیزوں کو کام کرنے کے لیے جتنے قوانین کی ضرورت ہے وہ سب اِس

کائنات کے اندر کارفرما ہیں، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں، اور ہواؤں کو اپنے حصہ کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کے معدنی اور ہوائی اور آبی اجزاء کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے اور گھاس جیسی جنس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی اور تری اور ہوا میں بیشمار حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ قوانین بھی تمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ نیک اور بد کی تمیز ہے۔ نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے۔ اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت، اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مترتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے اس

لیے کہ یہاں اس کا انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے۔ انسان کے سوا یہاں، کم از کم ہمارے علم کی حد تک، کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے تحت چل رہا ہے، اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے۔ یہاں روپیہ میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے۔ مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی، بلکہ اکثر گالیوں اور جوتیوں کی۔ یہاں مادی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں، مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبعی قوانین کی فرمانروائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبعی قوانین دے دیں، اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے مگر طبعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعہ سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطہ کے مطابق برآمد ہو سکیں مگر یہ کوشش بہت محدود پیمانہ پر ہے اور بے حد ناقص ہے۔ ایک طرف طبعی قوانین اس کو محدود اور ناقص بناتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریاں اس انتظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہیں۔

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کروں گا۔ دیکھیے، ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو اور اس کے گھر میں آگ لگا دے تو اس کا گھر جل جائے گا۔ یہ اس کے فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے مگر اس نتیجہ کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر جرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کر سکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اس کی آئندہ نسلوں کو ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا

اس کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ ظاہر ہو کر رہ جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کرکے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھولتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجیے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کر لیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے لگتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ملک کے ملک تباہ کر ڈالتے ہیں۔ کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور انسانی تاریخ پر اُن کی کارروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پشت در پشت اور نسل در نسل پھیلتا چلا جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چند اشخاص جس جرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر اُن کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے، یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے تب بھی کسی طرح وہ اُس نقصان کے برابر سزا نہیں پا سکتے جو انہوں نے کروڑہا انسانوں کو اور ان کی آئندہ بیشمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظامِ کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے ان کے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پا سکیں۔

اسی طرح ان نیک انسانوں کو لیجیے جنہوں نے نوعِ انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی اور ہدایت کی روشنی دکھائی، جن کے فیض سے بیشمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائیں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ ان کو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اُس عمل کا پورا صلہ حاصل کر سکتا ہے جس کا ردِ عمل اس کے مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، اول تو موجودہ نظامِ کائنات جن قوانینِ قدرت پر چل رہا ہے

ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب ہو سکیں۔ دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے ردِ عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانینِ قدرت کے تحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical World) اور اس کے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظامِ عالم درکار ہے جس میں حکمران قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو۔ جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مترتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مترتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پُوری طرح مترتب ہو سکیں۔ جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو۔ جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصہ میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا ایک نظامِ عالم ضرور ہونا چاہیے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے، وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقع میں ایسا کوئی عالم ہے بھی؟ تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے اور اسی طرح ہونے والی ہے۔ موجودہ نظامِ عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین، آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کرے گا اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا، اور

پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فرو گذاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردّ عمل دنیا میں ہوا ہے اس کی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہونگی جو اس ردّعمل سے متأثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے، اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہونگی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہونگے، وہاں کی مقداریں کچھ اور ہونگی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہونگے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کرسکے گا بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں۔ اور اسی طرح انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پہنچتے رہے ہیں، وہاں وہ ان کی پوری سزا بھگتے گا بغیر اس کے کہ موت اور بیہوشی آکر اسے تکلیف سے بچاسکے۔

ایسی زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، مجھے ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر کیوں دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا، تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہوسکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے۔ اس کے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

جون ۱۹۴۱ء

مطبوعاتِ جماعتِ اسلامی

دین و اخلاق

۱- دینیات مولانا مودودی مجلد ۲/-/۰

۲- خطبات 〃 〃 ۳/۸/۰

۳- اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر 〃 غیر مجلد ۱/-/۰

۴- تفہیمات حصہ اول 〃 مجلد ۴/-/۰

۵ 〃 حصہ دوم 〃 مجلد ۴/۱/۰

۶- حقیقتِ شرک مولانا اصلاحی غیر مجلد ۲/-/۰

۷- حقیقت توحید 〃 〃 ۱/۲/۰

۸- حقیقت تقویٰ 〃 〃 ۰/۱۲/۰

۹- اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر مولانا مودودی 〃 ۰/۶/۰

۱۰- مسئلۂ جبر و قدر 〃 〃 ۱/-/۰

۱۱- اسلام اور جاہلیت 〃 〃 ۰/۶/۰

۱۲- دینِ حق 〃 〃 ۰/۶/۰

۱۳- سلامتی کا راستہ 〃 〃 ۰/۶/۰

۱۴- تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں 〃 ۰/۶/۰

۱۵- مذہب کا انقلابی تصور منظر الدین صدیقی ۰/۶/۰

۱۶- شہادتِ حق مولانا مودودی غیر مجلد ۰/۶/۰

سیاست

۱۷- اسلام کا نظریۂ سیاسی مولانا مودودی غیر مجلد ۰/۸/۰

۱۸- الجہاد فی الاسلام 〃 مجلد ۹/-/۰

۱۹- مسئلۂ قومیت 〃 غیر مجلد ۱/۸/۰

۲۰- مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول 〃 ۱/۲/۰

۲۱- 〃 〃 〃 حصہ دوم 〃 ۲/۸/۰

۲۲- 〃 〃 〃 حصہ سوم 〃 ۲/۸/۰

۲۳- جہاد فی سبیل اللہ 〃 〃 ۰/۶/۰

۲۴- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ 〃 ۰/۶/۰

۲۵- اسلامی قانون مولانا مودودی 〃 ۱/۰/۰

۲۶- آزادی کے اسلامی تقاضے 〃 〃 ۰/۳/۰

۲۷- مطالبۂ نظامِ اسلامی 〃 〃 ۰/۳/۰

۲۸- مرتد کی سزا اسلامی قانون میں 〃 〃 ۰/۱۲/۰

سلسلۂ اسلامی سیاست:

۲۹- کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف۔ مولانا اصلاحی ۰/۳/۰

۳۰- شہریت کے حقوق و فرائض مولانا اصلاحی ۱/۰/۰

۳۱- اطاعت کے شرائط و حدود " ۰/۱۰/۰

۳۲- غیر مسلموں کے حقوق " ۰/۱۴/۰

تمدن و عمران

۳۳- تنقیحات مولانا مودودی مجلد ۳/۰/۰

۳۴- پردہ " " " ۳/۸/۰

۳۵- حقوق الزوجین " " غیر مجلد ۱/۸/۰

۳۶- اسلام اور ضبط ولادت " " ۱/۰/۰

۳۷- نیا نظام تعلیم ۰/۶/۰

۳۸- ایک اہم استفتاء " " ۰/۶/۰

۳۹- تجاؤ اور لیگ " " ۰/۶/۰

۴۰- اسلام کا نظام حیات " " ۰/۱۰/۰

۴۱- پاکستانی عورت دوراہے پر مولانا اصلاحی مجلد ۲/۱۲/۰

خواتین کے لیے

۴۲- روداد حلقۂ خواتین شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی ۰/۱۲/۰

معیشت

۴۳- سود حصہ اول مولانا مودودی مجلد ۳/۰/۰

۴۴- سود حصہ دوم مولانا مودودی زیر طبع

۴۵- انسان کا معاشی مسئلہ " غیر مجلد ۰/۶/۰

۴۶- اشتراکیت اور نظام اسلام مظہر الدین صدیقی مجلد ۵/۸/۰

۴۷- مسئلہ ملکیت زمین مولانا مودودی غیر مجلد ۱/۰/۰

تحریک اسلامی اور نظام جماعت

۴۸- تجدید و احیائے دین مولانا مودودی غیر مجلد ۱/۰/۰

۴۹- دستور جماعت اسلامی " " ۰/۳/۰

۵۰- روداد جماعت اسلامی حصہ اول ۱/۰/۰

۵۱- " " " حصہ دوم ۰/۱۲/۰

۵۲- " " " حصہ سوم ۲/۰/۰

۵۳- " " " حصہ چہارم (زیر طبع)

۵۴- " " " حصہ پنجم ۲/۰/۰

۵۵- دعوت دین اور اس کا طریق کار مولانا اصلاحی ۲/۱۲/۰

۵۶- جماعت اسلامی کی دعوت مولانا مودودی ۰/۶/۰

۵۷- انتخابی جد و جہد " ۰/۲/۰

۵۸- منشور جماعت اسلامی " ۰/۳/۰

مولانا مودودی کی معرکۃ الآرا تازہ اور ضخیم تصنیف

۵۹- رسائل و مسائل مجلد ۵/۱۲/۰

ناشر: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور پاکستان

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ھے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اھمیت حاصل ھے ، محتاج بیان نہیں ۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ھندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ھے ۔ کر رھا ھے ، اور کرتا رھے گا ۔ انشاءاللہ ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ھے ۔

اس میں جن اھم اور معرکۃالارا مسائل پر گفتگو کی گئی ھے ان میں سے چند یہ ھیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ھے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ★ ھیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ★ ڈارون کا نظریہ ارتقا
- ★ لباس کا مسئلہ
- ★ غلامی کا مسئلہ
- ★ نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت $(\frac{20 \times 26}{8})$ ۳۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ ۔ لاھور

سرورق ربن پرنٹنگ پریس ۔ بل روڈ ، لاھور میں چھپا